بیسویں صدی کے امرتسر میں، محبت کی انوکھی داستان۔

انگیزِس عرل

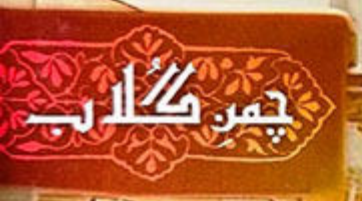

عبدالاحد

انتساب۔۔۔

کہتا تو میں بھی تھا اور مانتا بھی تھا، کہ کہانیاں رب العالمین لکھواتا ہے۔

انگیزشِ عدل کے وقت اس بات کا براہِ راست تجربہ کیا۔

اس لیے یہ تحریر میرے اللہ کے نام ہے، جس نے مجھے استطاعت دی۔

مجھے توفیق دی، میرے قلم کو یہ کہانی تحریر کرنے کا اعزاز بخشا۔

انگیزشِ عدل

از قلم عبدالاحد

(ناول)

جب خون بہتا ہے محبت کی خاطر
اَرض کی محبت کے خاطر
انسانیت سے محبت کی خاطر
تب خون انمول بن جاتا ہے
ہیروں سے زیادہ قیمتی بن جاتا ہے
وہ خون خون نہیں رہتا،
وہ لافانی قوت بن جاتا ہے
وہ خون جنون و عزم بن جاتا ہے
وہ خون ایک شمع بن جاتا ہے

جو دلوں میں جلتی ہے

روح کو سلگاتی ہے

اور یہی خون لا محدود ایندھن اس کا بن جاتا ہے

جب جسم چھیدے جاتے ہیں گولیوں سے

جب گردنیں اڑائی جاتی ہیں تلواروں سے

جب قید بنائی جاتی ہے مقدر گروہوں کی

وہ گروہ ہے جو لڑتے اپنی آزادی کے واسطے

بہاتے خون انصاف کی خاطر، عدل کی خاطر

اس انگیزش کی خاطر جو موت سے نڈر کر دے

تو سرکشی و بغاوت کی لہر جنم لیتی ہے

اور جان لو یہ بات تم آج،

لڑتا ہے انسان جو آزادی کی خاطر

نہ لڑتا ہے اپنے لیے، اپنی جان کے لیے

بلکہ لڑتا ہے وہ اپنی نسل، اپنے لوگوں کے لیے

جانتا ہے قید اذیت ناک ہوتی ہے

اور موت کو اس قید سے بہتر وہ جان لیتا ہے۔

اس لیے ایثار کا جذبہ دل میں وہ رکھتا ہے

خون اپنا بہاتا ہے، پیاروں کو اپنے گنواتا ہے

توجب دریافت کرو کہانی ایک ایسے انسان کی تم
جو عدل کی انگیزش لیے، لڑتا ہے آزادی کی خاطر
تو کبھی بھولے سے بھی تذلیل اس کی قربانیوں کی نہ کرنا۔
کہ اگر ہو نہ بے لوث انسان ایسے دنیا میں
تو شاید صبح کا سورج طلوع ہوتے تم یہ سوال کرتے خود سے
کہ آزادی کا چڑھتا دن نہ جانے کیسا دکھائی دیتا ہے؟

.....☆☆☆.....

تاریخ ہے پچیس مارچ۔
سال ہے انیس سو پندرہ۔
اور ملک ہے..... سنگاپور!
سنگاپور کی برٹش کراؤن کالونی میں کسی تہوار کا سماں ہے۔
خاکی یونی فارم میں ملبوس برطانوی سپاہیوں کی پریڈ جاری ہے۔
تُرم کے گرجدار سُر، ڈھول کی پرزور گونج فضا میں گردش کر رہی ہے۔
اولوالعزم برطانوی فوجی، سینا پھلائے، آنکھوں میں فتح کا ازلی تاثر سجائے سلطنتِ برطانیہ کے جھنڈے بلند کر رہے ہیں۔
مقتل کے گرد، بنجر میدانوں میں پندرہ ہزار کے قریب تماشائی جمع ہیں۔

بائیس مسلمان نوجوان، مقتل میں بندھے ہوئے ہیں۔ ان سے فاصلے پر بندوقیں تانے، ایک سو دس برطانوی سپاہی مقیم ہیں۔ وہ اپنے کمانڈر کے احکام جاری کرنے کے منتظر ہیں۔ حکم ملتے ہی، انھوں نے گولیوں سے ان بائیس نوجوانوں کے جسم چھید دینے ہیں۔

اب سوال ابھرتا ہے، یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟

کون تھے یہ نوجواں مسلمان؟

یہاں تک نوبت کیسے آئی؟

آیئے جانتے ہیں۔

پہلی جنگِ عظیم کے وقت، دس لاکھ سے زائد ہندوستانی مردوں نے بیرونِ ملک، برطانوی فوج کی خدمت کی۔ ان مردوں کو عام زبان میں "سی پائیز (sepoys)" بھی کہا جاتا ہے۔

اور یہ کہانی بھی ان سیپائیز کے ایک مسلمان لشکر کی ہے۔

ملاحظہ فرمائیں۔

اکتوبر انیس سو چودہ میں، سیپائیز کا ایک لشکر سنگاپور پہنچا۔

کرنل نے اعلان کیا کہ وہ لوگ ہانک کانگ میں تعینات کیے جائیں گے۔

تاہم ان کے درمیان ایک افواہ گردش کرنے لگی، کہ انہیں دھوکہ دیا جا رہا تھا، اور درحقیقت انہیں ترکی بھیجا جائے گا، جہاں جبراً انہیں اپنے ترک برادرانِ مسلمان سے لڑوایا جائے گا۔

البتہ سیپائیز خاموش رہے اور اس افواہ کی تصدیق ہو جانے کا انتظار کرنے لگے۔

اور جب الوداعی پریڈ میں ہانک کانگ کا کوئی ذکر نہ آیا، تو سیپائیز کو یقین ہو اچلا تھا کہ وہ افوائیں محض افوائیں نہ تھیں۔ بلکہ وہ سچ تھیں! انہیں واقعتاً دھوکہ دیا جا رہا تھا۔

اور پھر ابھرا اسماعیل خان، جس نے چلائی ہوا میں گولی۔ دیا اشارہ مسلمان سیپائیز کو، کہ بغاوت کے پر زور دور کا آغاز ہو چکا ہے!

دوپہر تین بجے کے قریب، سنگاپور کی برٹش کراؤن کالونی کو ان آٹھ سو سیپائز نے غالب لیا۔ انھوں نے چالیس برطانوی سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتارا، اور کمانڈر کو اپنے ہی محل میں نظر بند کیا۔

برٹش کراؤن کالونی اب بلا تحافظ تھی اور ان کے قبضے میں تھی۔

لیکن، دو دن بعد برطانوی جہاز سنگاپور بھیجے گئے۔ جنگ کا سما چھڑ گیا اور با آسانی ان برطانوی لشکروں نے ان سیپائز کو مار گرایا۔

ان آٹھ سو سیپائز میں سے، اکثریت ماری گئی، قلیل التعداد کو قید کیا گیا، بعض جنگلات میں فرار ہو گئے اور بقایہ کو، ان بائیس نوجوانوں کی طرح، سرِ عام موت کے گھاٹ اتارا گیا۔

اور کیا یہ تحریکِ بغاوت دنیا میں ابھرنے والی واحد کوشش تھی؟

ہر گز نہیں۔ دنیا بھر میں ایسی بیشتر بغاوتی تحاریک وجود میں آئیں۔ اور نہج کیا تھا؟ مسلمان فوجیوں کو خطیر تعداد میں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اور جنھیں موت نے گلے سے نہ لگایا، ان کی زندگیاں قید خانوں کی نذر ہوئیں۔

اور کیا یوں قتل و غارت کا یہ سلسلہ پہلی بار شروع ہوا تھا؟

ہر گز نہیں۔ خوں ریزی کے ایسے کھیل سالوں سے رچائے جا رہے ہیں اور آئندہ بھی رچائے جائیں گے۔

لیکن، ان موت اور فریب کے کھیلوں میں پتہ ہے کون پستا ہے؟

وہ عام لوگ، جن کے باپ بھائی شوہر مار دیے جاتے ہیں۔ جن کی زندگی کی کل متاع ایک جھٹکے میں چھین لی جاتی ہے۔ تکلیف و تڑپ، اور زندگی بھر کی دکھ بھری یاد ان کا مقدر بن جاتی ہے۔ جنگوں کے اختتام میں پورے پورے خاندان اجڑ جاتے ہیں!

.....☆☆☆.....

امرتسر، ہندوستان۔

سال ۱۹۲۰

زمین کی کوکھ سے آزادی حاصل کر کے، سنہرے گنبد والے گردوارے کی اوٹ سے سورج طلوع ہو رہا تھا۔ سورج کی کرنوں کی حدت میں وہ بھوری عمارتیں سنہری دکھائی دے رہی تھیں۔ ان پر نہایت حسین نقش بنے ہوئے تھے۔ فجر کی اذان کانوں میں داخل ہونے کی دیر تھی، اور امرتسر کی مسلمان کالونی کے ہر فرد کا دن شروع ہو جاتا تھا۔

تنگ گلیاں بچوں کی کھکھلاہٹ، سائیکلوں کی "رنگ رنگ" اور جوتوں کی چاپ سے جی اٹھتی تھیں۔

شہر گردوار، امرتسر ایک وسیع شہر ہے۔ نہ صرف اس کا رقبہ وسیع ہے، لیکن یہ مختلف ثقافتوں، روایات اور مذاہب کا گھر ہے۔ تمہیں یہاں مختلف رنگوں کے لوگ نظر آئیں گے، گویا اس شہر میں ایک جہاں آباد ہو۔

اتنی انفرادیت کے باجود بھی ایک شے تھی جو ان سب میں مشترکہ تھی۔

ان کے وجود پر تازہ زخم لگائے گئے تھے۔ جس کی بدولت، کچھ مدت کے لیے ہی سہی، وہ سب متحد ضرور ہو گئے تھے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ زخم کیسے لگے تھے اور ان کا ذمہ کس کو جائے گا؟

سوال کا جواب تم جلد جان جاؤ گے۔

فی الحال اپنی کہانی کا آغاز کرنے ہم اس مسلمان کالونی کی ایک گلی سے گزرتے ہیں۔

تنگ گلی کے دائیں اور بائیں اطراف عمارتیں کھڑی تھیں، جن کی دیواریں آپس میں چسپاں تھیں۔ جہاں مرد خطیر تعداد میں نظر آئیں گے، وہاں عورتیں اقلیت میں تھیں۔ مردوں نے سفید اچکن، اور سروں پر صافیں زیب تن کی ہوئی تھیں، جب کہ عورتوں نے خود کو اوپر سے نیچے جلباب کے تہوں میں ڈھکا ہوا تھا، یا کچھ نے ڈھیلے ڈھالے کرتا شلوار میں، جن پر کوئی کام نہ تھا۔

اسی بھیڑ میں ہم ایک لڑکی کا تعاقب کرتے ہیں، جو ہرے کرتا شلوار میں ملبوس تھی۔ سر پر اس کے ڈوپٹہ اسکارف کی صورت بندھا ہوا تھا۔ اس کے کمر تک آتے بھورے بال، فی الوقت ایک جوڑے میں قید تھے۔ سیاہ آنکھوں میں سرد مہری تھی اور دبا دبا سا تحکم بھی۔ وہ نہایت تیز قدم بڑھا رہی تھی۔ نہیں نہیں، وہ عجلت میں نہیں تھی، وہ فطرتاً تیز چلتی تھی۔

وہ جہاں سے گزرتی، وہاں مرد حضرات اپنے سروں کو خم کرتے اسے سلام پیش کرتے۔

وہ آنکھوں میں رعب جمائے، دبی دبی آواز میں ان کے سلام کا جواب دیتی۔ بلاشبہ، وہ نہ صرف اعلیٰ شخصیت کی حامل تھی، بلکہ ایک اونچے رتبے والی عورت تھی۔

بالآخر، اس کی منزل آگئی تھی۔

وہ ایک منزلہ عمارت پر مشتمل بیکری تھی۔ اس نے چبوترا چڑھا اور لکڑی کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔

باہر لکڑی کی تختی لگی ہوئی تھی جس پر لکھا ہوا تھا:

"چمنِ گلاب

جہاں خوشیاں بانٹی جاتی ہیں۔"

.....☆☆☆.....

یہ ایک دو منزلہ سرائے کا منظر ہے، جس نے نہ جانے کتنے سیاحوں کو پناہ دی ہوئی تھی۔

پہلی منزل میں ایک مختصر جیا خانہ تھا۔ بالائی منزل میں راہداری تھی جس کے دائیں اور بائیں اطرف، کمرے ہی کمرے تھے۔

ہم اس راہداری کے آخری کمرے کا رُخ کرتے ہیں۔

کمرے میں خراٹوں کی آواز گونج رہی تھی۔ وہ نرم و ملائم بستر پر سیدھ میں لیٹا، نیند کی وادیوں میں کھویا ہوا تھا۔ کھڑکی سے دھوپ داخل ہو رہی تھی، لیکن خواب چشمی کی حالت میں ہی وہ چہرے پر تکیہ رکھ چکا تھا۔

یکبارگی دروازہ بج اٹھا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور گہری سانسیں لینے لگا۔ اس کا پورا جسم پسینے میں شرابور تھا۔

"مسٹر البرٹ ونسٹن۔ نو بج چکے ہیں۔ اٹھ جائیں۔" شائستہ مردانہ آواز، اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ اس آواز کی پیروی، قدموں کی چاپ نے کی جو کہ رفتہ رفتہ مدہم پڑ رہی تھی۔

اپنی سانسیں اور حواس بحال کرتے اس نے سائیڈ ٹیبل سے تانبے کا گلاس اٹھایا جس میں پانی بھرا ہوا تھا اور گھٹا گھٹ پی گیا۔ ایک تو امرتسر کی بے رحم گرمی کی اسے اب تک عادت نہ ہوئی تھی۔

وہ سر جھٹکتے کھڑا ہوا اور غسل خانے جانے لگا۔ اسے خود کو ایک مصروف دن کے لیے تیار کرنا تھا۔

.....☆☆☆.....

"لڑکیوں!" بیکری میں داخل ہوتے ہی اس نے استحکام سے دو تالیاں پیٹیں اور اپنی گرجدار آواز میں بولی۔

ملازمائیں یک دم چونک اٹھیں اور مرعوب ہوتے اسے دیکھنے لگیں۔ سب کے چہروں پر خوف کی رمق تھی جیسے وہ کچھ غلط کر بیٹھی ہوں۔

اس نے بائیں جانب نظر دوڑائی۔ یکبارگی سیاہ آنکھوں میں تپش ابھری۔

"ہمیں یہ میز خالی کیوں دکھائی دے رہی ہے؟ کہاں ہیں کیکس، بسکٹس؟" وہ انگشتِ شہادت سے خالی میز کی جانب اشارہ کرتے، سختی سی بولی۔

ملازمائیں ایک دوسرے کو چور نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔

دفعتاً ایک بھاری بھرکم جسامت کی ملازمہ اس کی جانب بڑھی۔ اس کے چہرے پر ندامت کا سایہ تھا۔ اس نے چمنِ گلاب کی مدبر مالکن کے مقابل کھڑے ہو کر، گردن جھکالی۔

"چابی ہمارے پاس تھی، یاسمین صاحبہ۔ ہم معذرت خواہ ہیں۔ دراصل، ہماری آنکھ دیر سے کھلی۔"

یاسمین کی سرد آنکھوں میں ایسا تاثر تھا، جیسے پلک جھپکتے ہی وہ اس لڑکی کو کھا جائے گی۔ شاید وہ اشتعال میں تھی، یا شاید آنکھوں کا یہ تاثر فطری تھا۔

"خطا کتنی بھی بڑی کیوں نہ ہو، روشی۔ آئندہ معافی مانگتے وقت اپنی گردن جھکنے نہ دینا۔" لہجہ سرد، دھیما اور رعب دار تھا۔

روشی نامی وہ بھاری بھرکم ملازمہ نے کرنٹ کھانے والے انداز میں اپنی گردن اٹھائی۔ چہرے پر ندامت شدید ہوئی۔ اغلاط کی فہرست بڑھتی جو جا رہی تھی۔

"ہم مسلمان ہیں۔ خدا کے علاوہ کسی ذات کے آگے گردنیں نہیں جھکاتے۔" کہتے کہتے، شان سے اس کی گردن اکڑ گئی۔ اس نے کہنی پر لٹکا پرس روشی کے حوالے کیا اور سب چھوڑ چھاڑ کر باورچی خانے کی جانب بڑھ گئی۔

جب کہ روشی جامد سی کھڑی رہ گئی۔ چہرہ سُرخ ہونے لگا۔

.....☆☆☆.....

وہ اپنے کمرے کا دروازہ کھولنے ہی لگا تھا کہ اس کی نگاہ زمین بوس بھورے لفافے پر پڑی۔ اسے دیکھتے ہی وہ بے اختیار مسکرا دیا۔ شہد رنگ آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے جھک کر لفافہ اٹھایا۔ لفافے کے اندر سے ایک خط برامد ہوا۔ وہ اس کے والد، فرینک ونسٹن کی طرف سے تھا۔

"ڈیئر البرٹ۔

بات کا آغاز کرنے سے قبل میں معافی طلب کرنا چاہوں گا، کیونکہ پچھلے ہفتے میں ہندوستان نہیں آسکا۔ میری مصروفیات نے مجھے اجازت نہیں دی۔ دل للچا رہا ہے لیکن بعض چیزیں اپنی ذمہ داریوں کے عوض، قربان کرنی پڑتی ہیں۔

میں اور مسز ونسٹن امید کرتے ہیں کہ تم خیریت سے ہوگے اور اپنے اس سفر سے لطف اٹھا رہے ہوگے۔ پچھلے دو سال سے تمھارے دیدار کو ہماری آنکھیں ترس گئی ہیں، لیکن یہ جان کر کہ تم خوش ہو، ہم اپنے دل کو مطمئن کر لیتے ہیں۔ ویسے بھی دنیا گھومنے کا شوق کسے نہیں ہوتا؟ اور ہندوستان جیسے خوبصورت دیس میں کس کا دل نہیں لگ سکتا؟

آہ! ہندوستان کی زمین۔ جب یہ زمین یاد آتی ہے تو دل میں ایک پر مسرت احساس رونما ہو جاتا ہے۔ بڑی محبت ہے اس سرزمین سے مجھے۔ یہ زمین ویسے تو دنیا کا ہی ایک حصہ ہے، لیکن اس میں ایک پورا جہاں آباد ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایک ہی زمین پر اس قدر مختلف رنگوں، روایتوں اور مذاہب کے لوگ کیسے اکھٹا ہیں۔

شاید ہندوستان کی زمین سے یہ بے نام محبت، تمہیں وراثت میں ملی ہے۔

اب ہم اگلے ماہ برطانیہ میں تمھارے منتظر ہوں گے۔ خیر وعافیت سے لوٹنا اور ہندوستانی سوغات ضرور لانا۔

خداوند تمہیں اپنی امان میں رکھے۔"

خط پڑھ کر اس کے اندر تر و تازگی سرائیت کر گئی۔ قلب کو اطمینان نصیب ہوا۔

خط ٹیبل پر رکھتے، وہ کمرے سے باہر نکلا اور نیچے اترا۔ باہر کے رستے تک وہ جیا خانے کے عملے کے ایک ایک فرد کو مسکرا کر سلام کرتا۔ طبیعت سے وہ کافی خوش اخلاق و ملنسار معلوم ہوتا تھا۔

باہر آکر اپنی سائیکل پر سوار ہوا اور ایک دفعہ پھر شہر امرتسر کی سیر پر نکل پڑا۔

یہی تو اس کا کام تھا!

اور البرٹ ونسٹن کو اپنے کام سے عشق تھا۔

.....☆☆☆.....

وہ باورچی خانے میں کھڑی تھی۔ میز پر بڑا سا تھال تھا، جس میں گندمی رنگ کا خمیری آٹا تھا۔ وہ اس آٹے پر مکے ایسے برسا رہی تھی جیسے اپنی ساری بھڑاس نکالنا چاہ رہی ہو۔ ملازمائیں جامد ہو کر اسے دیکھ رہی تھیں۔ آج کے دن سب نہایت احتیاط سے اپنے کام انجام دے رہے تھے، کیونکہ معمولی سی کوتاہی بھی جان لیوا ثابت ہو سکتی تھی۔

وہ آٹے کے پیڑے بنا بنا کر چکور سانچوں میں بھر رہی تھی۔ بلکہ، بھر نہیں رہی تھی، پٹخ رہی تھی!

"یہاں کھڑی کیا کر رہی ہیں آپ سب؟" وہ نظریں اٹھائے بغیر، کام میں مگن ہو کر بولی تو تمام ملازمائیں ہم آہنگ ہو کر چونک گئیں۔

"ایک تو ویسے بھی آپ کی وجہ سے تاخیر ہو رہی ہے، اور پھر آپ سب یہاں ہاتھ پاؤں بھی نہیں چلا رہیں۔ جائیں جا کر بسکٹس خطائیاں اور کیکس باہر رکھیں۔ کچھ دیر میں گاہکوں کا رش لگ جائے گا۔" اب کی بار آواز بلند ہوئی اور آنکھوں میں دبا دبا سا طیش ابھرا۔ لیکن بولتے وقت اس نے کسی کو بھی نہ دیکھا تھا۔

ملازمائیں ڈانٹ کھا کر تیز تیز ہاتھ چلانے لگیں، لکڑی کی ٹریز کو خطائیوں اور کیکس سے سجا سجا کر باہر لے جانے لگیں۔

جبکہ سیدہ یاسمین سر جھٹکتے اپنے کام میں مشغول رہی۔

.....☆☆☆.....

وہ چہرے پر مسکراہٹ طاری کیے ان تنگ گلیوں میں اپنی سائکل دوڑا رہا تھا۔ اس گرمی میں بھی وہ روز ایسے ہی بازاروں میں گھومتا تھا اور ہمیشہ کی طرح یہ بازار اس کا دل باغ باغ کر دیتے۔ کاش اس طرح کی رونق برطانیہ میں بھی ہوتی، وہ ہمیشہ دل ہی دل میں سوچا کرتا تھا۔

ہندوستان کو رنگوں کا دیس، بلاوجہ تو نہیں کہا جاتا۔

یہاں لوگوں کی خدوخال رنگین تھی تو ان کے لباس بھی رنگین تھے۔ نہ صرف لباس بلکہ ان کے پکوان اور مٹھائیاں بھیں رنگ برنگی تھیں۔ ان کے تہوار بھی رنگین تھے۔ ہندو جن بتوں کو پوجتے تھے وہ تک رنگین ہوتے تھے۔ مندروں سے لے کر، گردواروں سے لر کر مسجدوں تک، ہر عمارت رنگین تھی۔

اسی لیے تو ہندوستان تھا.....رنگوں کا دیس۔

اس کی نظر لکڑی کی اس تختی پر پڑی جس پر چمنِ گلاب لکھا ہوا تھا۔ انجانی سوچ کے تحت، اس نے سائیکل وہاں روکی۔ وہ اس گلی سے پہلے کئی مرتبہ گزر چکا تھا، لیکن چمنِ گلاب کا دورا کرنے کا اتفاق نہ ہوا۔ وجہ یہی تھی کہ اسے میٹھے میں خاص دلچسپی نہ تھی۔

البتہ، آج وہ اس بیکری کی سوغات آزمانے کا تعین کر چکا تھا۔ امرتسر میں قیام کے دوران اس نے چمنِ گلاب کی شان میں اتنے قصیدے سن لیے تھے، کہ اب وہ آپ ہی ان کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔

اس نے یہ سن رکھا تھا کہ اس بیکری کی مالکن کوئی امیر بیوہ ہے، جو دل کی نہایت نرم اور صحبت سے شفیق ہے۔

ان ہی سوچوں میں گم اس نے بیکری کا دروازہ کھولا اور ایک قدم اندر بڑھایا۔

اس نے بیکری میں صرف دو قدم ہی بڑھائے تھے کہ وہ تھمنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ ڈبل روٹی، کیکس اور بسکٹس کی خوشبوؤں کا آپس میں امتزاج پیدا ہوا۔ کیا زبردست خوشبو تھی وہ؟ اس کی آنکھوں کے پتلے پھیلے۔ اب تو اس بیکری کی سوغات آزمانے کے لیے وہ پہلے سے بھی زیادہ پرجوش تھا۔

اس نے نظر اٹھا کر اس بیکری کا ایک مختصر جائزہ لیا۔ بیکری کافی چوڑی اور لمبی تھی۔ بائیں طرف ایک میز تھی جو اختتام تک جاتی تھی۔ اس کے ساتھ ایک دو جی میز لگائی گئی تھی۔ یوں دونوں میز مل کر "ایل" شیپ بناتی تھیں۔ ان میزوں پر، ترتیب سے خطائیوں اور کیکس کی ٹریز سجی ہوئی تھیں۔ دائیں طرف کچھ کرسیاں بھی رکھی گئی تھیں۔ اختتام پر ایک دروازہ بھی تھا جو کہ یقیناً بیکری کے باورچی خانے کو کھلتا تھا۔

چہرے پر نرم صحبت مسکراہٹ سجائے وہ یاسمین کی جانب قدم بڑھانے لگا جو سیدھ میں ہی، میز کے پیچھے کھڑی تھی۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔" اپنی طرف اس برطانوی مرد کو آتے دیکھ کر وہ زیر لب بڑبڑائی۔ دن کا آغاز وہ ہمیشہ بسم اللہ سے کرتی تھی۔

اس کے سامنے پہنچ کر، البرٹ نے ادب سے اپنے سر کو خم دیا۔

آپ کی بیکری کی سب سے خاص سوغات کیا ہے؟" لبوں کو مسکراہٹ میں ڈھالتے، وہ شیریں لہجے میں بولا۔

لیکن اس لڑکی کی ان آنکھوں کو دیکھ کر اس کی مسکراہٹ فنا ہوئی۔ وہ اسے ایسے دیکھ رہی تھی جیسے اسے کچا چبا جائے گی۔ البرٹ خود ساختہ ہو گیا۔ اسے لگا، جیسے انجانے میں وہ کوئی خطاء ہی کر بیٹھا ہے۔

"آپ ہمارے بسکٹس آزما سکتے ہیں۔" اس کا لہجہ اتنا ہی ٹھنڈا تھا جتنا البرٹ کا گرم۔

البرٹ کو تو وہ لڑکی نہایت بد اخلاق لگی۔ نہ جانے اس بیکری کی شفیق و ہمدرد مالکن کی کیا مجبوری ہو گی جو اسے کام پر رکھ لیا؟ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

"میں دو لینا چاہوں گا۔" اپنی دو انگلیاں بلند کرتے وہ منہ بناتے بولا۔ سارا موڈ پل بھر میں اس مغرور لڑکی نے بگاڑ دیا تھا۔

یاسمین نے بھورے لفافے میں دو بسکٹس ڈالے اور اسے تھما دیے۔ وہ قیمت ادا کرتے، ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے کے زاویے بری طرح بگڑ چکے تھے۔ خوشبوؤں سے ہونے والے اس گرمجوش استقبال کا سارا اثر، اس لڑکی کے ناگوار مزاج نے زائل کر دیا تھا۔

کوئی اپنے گاہکوں سے ایسے پیش آتا ہے؟ دل ہی دل میں وہ بس کوستے گیا، کیونکہ اس کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔

بہر حال، اس نے دونوں بسکٹس نکالے۔ پس منظر میں مسلسل گھنٹی کی آواز گونج رہی تھی، یعنی آہستہ آہستہ بیکری میں گاہکوں کا رش بڑھ رہا تھا۔

اس نے خفگی سے سر جھٹکتے بسکٹ منہ میں رکھا۔ اب کہ وہ ان بسکٹس سے اتنی امیدیں وابستہ نہیں کر رہا تھا۔

لیکن پھر کچھ غیر متوقع ہوا۔ اس کی آنکھوں میں ارتعاش پیدا ہوا مگر وہ ساکت و جامد رہ گیا۔

بسکٹ انتہا سے زیادہ لزیز تھا!

بسکٹ تھا تو کڑک، لیکن زبان سے ٹکراتے ہی گھل کر اس کے حلق میں اترتا چلا گیا۔ بسکٹ کا ذائقہ زبان پر پھیلتے ہی باقی کا بسکٹ اسے دعوت دینے لگا کہ: آؤ مجھے کھاؤ۔

اور اس دعوت سے وہ کیسے انکار کرتا۔ پل بھر میں، وہ بسکٹ اس کے پیٹ کی زینت بن گئے تھے۔ بسکٹ کھانے کے بعد البرٹ کو یوں لگا جیسے اس کی زندگی کی ساری خوشیاں ہی ختم ہو گئیں۔

واقعتاً، چمنِ گلاب میں خوشیاں ہی بانٹی جاتی تھیں۔

وہ اپنا کوٹ جھاڑتے کھڑا ہوا اور پھر سے اس لڑکی جانب بڑھنے لگا۔ وہاں ایک قطار لگی تھی۔ اسے کچھ لینا تو نہیں تھا لیکن یہ سوچ کر کہ وہ بدمزاج لڑکی کسی بات پر اعتراض ظاہر نہ کرے، وہ قطار میں کھڑا ہو گیا اور اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔

کچھ دیر کے انتظار کے بعد اس کی باری آگئی تھی۔

"ہیلو مس۔" وہ خوش اسلوبی سے بولا تھا۔ "مجھے اس بیکری کی مالکن سے ملنا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ فوراً ملاقات ہو جائے، کسی اور دن ہو جائے میرے لیے کافی ہو گا۔ یا آپ مجھے ان کا پتہ بتا دیں میں خود جا کر مل آؤں گا۔" کہتے کہتے اس نے ایک چور نظر اس کی آنکھوں میں ڈالی تھی اور اب بھی اس کی آنکھوں میں وہی جارحانہ تاثر تھا جیسے وہ اس کے خون کی پیاسی ہو۔

ان آنکھوں کو دیکھ کر وہ سوچنے لگا کہ، جنگوں میں جدید ہتھیاروں کی جگہ اس لڑکی کو لے جانا چاہیے تھا، اس کی یہ آنکھیں پورے کے پورے لشکر تباہ کرنے کی سکت رکھتی تھیں۔

"جی فرمایئے۔" وہ اپنے سر دبر فیلے انداز میں بولی تو اسے لگا وہ اس کا مذاق اڑا رہی ہے۔

"آپ شاید کچھ غلط سمجھ رہی ہیں، مس۔ میں اس بیکری کی مالکن سے ملنا چاہتا ہوں۔" وہ بدستور بولا۔

یاسمین کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔

"آپ کو کیا لگتا ہے کہ اس بیکری کی مالکن کون ہو گی؟" اس نے الٹا اسی سے سوال کیا۔

"ہوں گی کوئی میری گرینی کی عمر کی۔" اس لڑکی کے طنز کو نظر انداز کرتے، اس نے معصومیت سے جواب دیا۔

یاسمین نے اسے دیکھتے ایک ٹھنڈی سانس خارج کی۔

"پھر ہم آپ کی غفلت کا بلبلہ پھوڑنا چاہیں گے۔ اس بیکری کی مالکن ہم ہیں۔ چمنِ گلاب ہمارا ہے۔" دوٹوک انداز میں البرٹ کے اوپر انکشاف کیا۔

البرٹ کے چہرے کی رنگت سفید پڑی۔ اس نے نامحسوس انداز میں پیر پٹخا۔

"اگر آپ اجازت دیں تو ہم اپنا کام جاری رکھ سکتے ہیں؟" یاسمین نے اس کے پیچھے لمبی قطار کی طرف اشارہ کیا تو وہ سر جھٹکتے وہاں سے چلا گیا۔

چمنِ گلاب کی سوغات کے بارے میں کوئی بھی غلط نہ تھا، ہاں اس کی مالکن کے بارے میں سب ہی غلط تھے۔ یقیناً وہ لوگ اسے ہمدرد اور شفیق طنزاً کہتے ہوں گے۔

اپنی سائیکل کی نشست پر براجمان ہوتے وہ تلخ نظروں سے، تختی کو دیکھنے لگا۔

"میں نے تو سنا تھا کہ مسلمان عورتیں دبی دبائی ہوتی ہیں۔" وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔

کبھی واپس نہ آنے کا فیصلہ کر کے وہ وہاں سے چلا گیا۔

.....☆☆☆.....

صبح کا سورج باسی ہو رہا تھا۔ دوپہر کے وقت، کڑکتی دھوپ امرتسر کی گلیوں کو سیکنے میں کوئی کثر نہ چھوڑ رہی تھی۔

اسی دوپہر، ہم تھانے کا رُخ کرتے ہیں۔ جہاں چیف پولیس افسر، مسٹر لوئیس، سربراہی کرسی پر براجمان تھے۔ ان کی آنکھوں میں برہمی تھی اور چہرے کے زاویوں میں تناؤ حائل تھا۔ ان کے سامنے، میز پر ایک سفید پامفلیٹ رکھا ہوا تھا۔

ان کے مقابل، فاصلے پر ایک نوجوان کھڑا تھا۔ سر پر اس نے خاکی رنگ کی ٹوپی پہنی تھی، جس کی سرحدوں کو پار کر کے، شہد رنگ بال ظاہر ہو رہے تھے۔ اس کے کوٹ پر ایک تختی تھی، جس پر اس کا نام درج تھا: "جیمس اینڈرسن"

جھکی گردن، اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ فی الوقت وہ اپنے باس سے ڈانٹ وصول کر رہا ہے۔

"تو سنو مسٹر جیمس!" لوئیس نے جارحانہ انداز میں پرچہ اٹھایا اور اسے پڑھنا شروع کیا۔

"ہم تمام مسلمان، ہندوؤں اور سکھوں کو دعوت دیتے ہیں کہ برطانوی اشیاء کے اس بائیکاٹ میں ہمارا ساتھ دیں۔ خلافتِ عثمانیہ کو توڑنے کے ان منصوبوں کو ہم لوگ کسی صورت کامیاب ہونے نہیں دے سکتے۔ وہ جنگوں میں لے جا کر ہمارے ہی لوگوں کو خون ریزی کا نشانہ بناتے ہیں، پھر کیسے ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ سکتے ہیں؟

اپنے گھروں سے نکلو، برٹش راج کے خلاف آواز اٹھاؤ۔ تمھاری آواز تمھارا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔"

ایک وقفہ لے کر انھوں نے غصیلی نگاہ جیمس پر گاڑی۔

"خلافت زندہ باد۔ انقلاب زندہ باد۔ برٹش راج مردا باد۔" آخری سطر پڑھ کر پامفلیٹ میز پر پٹخ دیا۔

جیمس کے جسم کا درجہ حرارت بڑھنے لگا۔

"کیا تم نے نہیں کہا تھا کہ تمام پریس بند ہو چکے ہیں، جیمس؟ مجھے جواب چاہیے۔ سب بند ہو جانے کے باوجود یہ پامفلیٹ بازاروں میں کیا کر رہا تھا؟ کیا تمھارے پاس اس نااہلی کی تگڑی وضاحت موجود ہے؟" وہ بھڑک اٹھے۔

جیمس نے بالآخر سر اٹھایا۔ کھڑکی سے آتی دھوپ اس کے چہرے پر پڑی تو بھوری آنکھیں شہد رنگ کی دکھائی دیں۔ شہد رنگ بال، سنہرے ظاہر ہو رہے تھے۔

"سر، تمام پریس بند ہیں۔ ان سب کو گرفتار کیا گیا ہے، جو احتجاج و اجلاس کی تدابیر بنا رہے ہیں۔ مگر۔ مگر شاید پریس بند ہونے کے بعد، یہ ہندوستانی دوسرے ذرائع استعمال کرنے لگے ہیں۔" اس نے سپاٹ آواز میں بات جاری رکھی۔

"مجھے کچھ نہیں پتہ جیمس۔ ہم، جلیاں والا باغ کے سانحے کو نہیں دہرا سکتے۔ اب اگر کوئی چیز خراب ہوئی، تو اس کے زمہ دار تم ہوگے۔ جو بھی یہ حرکت کر رہا ہے، اسے ڈھونڈ نکالو۔" انداز پہلے سے قدرے ٹھنڈا تھا۔

"جی سر۔ میں پوری کوشش کروں گا۔ دنگا کرنے کی نیت کرنے والے پکڑے جائیں گے۔" اس کی آنکھوں میں پر اعتمادی تھی۔

"زبانی دعوہ کافی نہیں ہے، جیمس۔" وہ کوٹ جھاڑتے کھڑے ہوئے۔ "ان دعوؤں کو سچ کرنا ہو گا تمہیں۔" کہہ کر وہ چلے گئے۔

پیچھے جیمس تنہا رہ گیا۔ بھوری آنکھوں میں پر سوچ تاثر قائم تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر پامفلیٹ اٹھایا اور استفہامیہ نگاہوں سے اس کی جانچ پڑتال کرنے لگا۔

یکبارگی اس کی نظر ایک داغ پر پڑی جس کا حجم بس ایک نقطے جتنا تھا۔ اس نے زبان سے اس داغ کو چاٹا تو مٹھاس اس کے حلق میں اتری۔ چہرے کا پر سوچ تناؤ ڈھیلا ہوا۔

"شیرا؟" وہ الجھ کر خود کلامی کرنے لگا۔

اپنے نتھنوں کو قریب کر کے وہ اس کاغذ کو سونگھنے لگا۔ ایک شناسا مہک اس کے نتھنوں سے ٹکرائی تو لبوں کو اس نے مسکراہٹ میں سجالیا۔

"لگتا ہے، دنگا کرنے والوں کو میٹھے کا ضرورت سے زیادہ شوق ہے۔" شاطر مسکراہٹ میں لبوں کو ڈھالتے، وہ آپ ہی بڑبڑایا۔

یقیناً اس کے دماغ میں کوئی گھنٹی بج چکی تھی۔

.....☆☆☆.....

رفتہ رفتہ سورج ڈھلتا گیا۔ دن کا اجالا مدہم پڑا، اور ایک وقت آیا کہ سورج پھر سے زمین کی کوکھ میں گم ہو گیا۔ رات کی تاریکی نے آسمان پر چادر پھیلائی اور ہلال آسمان پر دمکنے لگا۔ نیم ٹھنڈی ہوا، کھلی کھڑکی کے ذریعے اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔

وہ اپنی اسٹڈی ٹیبل پر کاغذ پھیلائے بیٹھا تھا۔ قلم اس کے ہاتھ میں تھا اور اپنی کرسی سے ٹیک لگائے گردن موڑ کر وہ آسمان پر چمکتے اس خوبصورت چاند کو مبہوت سا ہو کر تک رہا تھا۔ یکدم اس نے جھٹکا کھایا اور کاغذ کی طرف متوجہ ہوا۔

جی ہاں، البرٹ ونسٹن ایک لکھاری تھا۔ کوئی معمولی لکھاری نہیں، بلکہ اس کا شمار برطانیہ کے مشہور ترین فکشن نگاروں میں ہوتا تھا۔ فی الوقت، وہ اپنے ہندوستان کے سفر نامے پر کام کر رہا تھا۔ یہ اس کی پہلی نان فکشن کاوش تھی اس لیے وہ اس پر جوش و استقلال کے ساتھ کام کر رہا تھا۔

اس جہاں میں اسے تین شے عزیز تھیں، لکھائی، کھانا پینا اور ہندوستان!

تو پھر کیا تھا، ایک دن اپنے کاغذات کے پلندے اٹھائے اور ہندوستان بھاگا بھاگا آ گیا۔ دو سالوں میں وہ ہندوستان کا صوبہ صوبہ گھوم چکا تھا۔ اس کی توجہ کا مرکز، ہندوستان کی ثقافت و ریت روایات تھیں اور یہاں کے منفرد اور لذیذ پکوان بھی، جنہوں نے اس کے دل میں گھر کر لیا تھا۔

اب وہ پنجاب میں تھا اور یوں کہا جا سکتا ہے کہ امرتسر اس کی آخری منزل تھی، کیونکہ اس کے بعد اس نے برطانیہ واپس چلے جانا تھا۔

لکھنے سے قبل اس نے ایک سانس خارج کی۔ دماغ میں الفاظ اجاگر ہونے لگے تھے۔ البرٹ نے کاغذ کے صفحے پر قلم کی نوک رکھتے لکھنا شروع کیا۔

.....☆☆☆.....

وہ تنگ گلی میں تنہا تھی، جس کے دائیں اور بائیں اطرف عمارتیں ہی عمارتیں تھیں۔ اس گلی میں، کچھ ہی دوری پر اس کے گھر کی دو منزلہ عمارت کھڑی تھی۔ شاید وہ کسی سوچ میں تھی، کیونکہ اپنی فطرت کے برعکس وہ سست روی سے قدم بڑھا رہی تھی۔

جوں ہی اس کی نظر ایک بچے پر پڑی جو اس کے گھر کے سامنے گردن جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ تھم کر اس بچے کو دیکھنے لگی۔ کسی سوچ کے تحت، وہ پھر سے چلنا شروع ہوئی۔

جب اس بچے نے اپنی طرف بڑھتے ان قدموں کو سنا تو اس نے اپنا چہرا اٹھایا۔

وہ چہرا یاسمین کے لیے شناسا تھا۔ وہ بھنویں سکیڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ البتہ چہرا اب بھی پتھریلا تھا۔

"سریش!" اس نے زیرلب اس بچے کو پکارا۔

.....☆☆☆.....

اس کا قلم کاغذ پر روانی سے چل رہا تھا اور اب وہ پوری طرح سے دنیا سے منقطع ہو کر لکھ رہا تھا۔

"آج میرا امرتسر کی مشہور بیکری چمنِ گلاب جانے کا اتفاق ہوا۔

ویسے تو اس کے بارے میں پہلے لاتعداد مرتبہ سن چکا ہوں، لیکن یہ سوچ کر وہاں کا دورہ نہ کیا کہ مجھے میٹھے کا اتنا شوق نہیں۔ میں پورا ہندوستان گھوما ہوں، اور ان کی مٹھائیوں سے ایک شکوہ رہا ہے کہ ان میں مٹھاس ضرورت سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ یوں کہ کھانے کے بعد حلق میں نہ ختم ہونے والی کڑواہٹ گھل جاتی ہے جو کہ کسی ہمزاد کی طرح پورے دن ساتھ رہتی ہے۔ تاہم میں میٹھا کھانے سے گریز کرتا ہوں۔

لیکن شاید وہ نام میرے دل کو بھایا تھا: ”چمنِ گلاب“۔ اور بس میں نے وہاں کی سوغات آزمانے کا فیصلہ لیا۔ کھانے کے معاملے میں، میں ویسے بھی دماغ سے زیادہ دل کی سننے کا عادی ہوں۔“

.....☆☆☆.....

اس گلی میں خاموشی رقصاں تھی۔

سریش نامی اس بچے کی نم آنکھوں کا ٹکراؤ یاسمین کی ان سرد و سفاک آنکھوں سے ہوا۔ وہ سست روی سے گھٹنوں کے بل بیٹھی اور نرمی سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ چھوٹا بچا اس کی موجودگی میں پر سکون محسوس کر رہا تھا، شاید اس لیے کہ وہ یاسمین سے مانوس تھا۔

”گھر میں سب خیریت تو ہے۔“ آواز قدرے نرم تھی لیکن چہرا اب بھی پتھریلا۔ وہ اب اس کے گہرے سانولے گال سہلانے لگی۔

”آج میرا جنم دن تھا اپیا۔“ ایک بار پھر اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور وہ رونے لگا۔

”پتا جی کی بہت کمی محسوس ہو رہی ہے۔ وہ مجھے ہر سال میرے جنم دن پر گھمانے لے کر جاتے تھے۔ ہمارے گھر میں خوشی کا سما ہوتا تھا۔“ وہ اداس سا مسکرایا۔ ”وہ کہتے تھے میں ایک چمتکار ہوں۔ جب انھوں نے اولاد کی امید چھوڑ دی تھی تب میرا جنم ہوا۔ لیکن اب۔ اب وہ نہیں رہے اپیا۔ میرا گھر میں دم گھٹ رہا تھا اور میں بھاگ گیا۔“ اس نے بات ختم کی تو بھورے بالوں والی لڑکی نے اپنی انگلیوں سے اس کے چہرے پر پھیلی نمی رگڑی۔

.....☆☆☆.....

”بہر حال میں وہاں کی نگراں سے جا ملا۔ اور مجھے وہ شکاری آنکھیں اب بھی وحشت زدہ کر رہی ہیں کہ جیسے کسی کے خون کی پیاسی ہوں۔ اور پھر اس کی زبان تو اس قدر کڑوی تھی کے بس۔ ایسا نہیں تھا کہ میں نے کوئی بد تمیزی کی تھی۔ لیکن پھر بھی ان کے مزاج میں کج خلقی کا عنصر قائم تھا۔

برے دل کے ساتھ میں نے دو بسکٹ لے ہی لیے۔ میری ان سے خاص امیدیں وابستہ نہیں تھیں۔ لیکن پھر جب میں نے انہیں چکھا تو بس! ایسا محسوس ہوا جیسے میری روح جنتوں سے گزر کر دنیا میں لوٹی ہو۔

وہ بسکٹ ہر طرح سے کامل تھے۔ متوازن مقدار میں موجود مٹھاس البتہ ہلکے سے نمکین بھی تھے۔ ان میں کافی کی مختصر کڑواہٹ تھی اور ونیلا کی تازگی بھی۔ بسکٹ میں شامل کیے گئے تمام اجزاء کی مناسب مقدار میں موجودگی اس بات کی ضمانت تھی کہ انہیں بنانے والا اپنے کام میں مہارت رکھتا ہے اور شاید اسے سالوں کا تجربہ بھی حاصل ہے۔ میں نے کئی اقسام بسکٹ کھائے ہیں، لیکن ان جیسا آج تک نہیں کھایا۔"

.....☆☆☆.....

ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اس گلی سے گزرا تو یاسمین کے ماتھے پر بکھری آوارہ لٹیں جھول اٹھیں۔

اس نے اپنے پرس سے ایک بھورا تھیلا نکالا اور اس چھوٹے بچے کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"سالگرہ مبارک سریش۔" وہ مسکرائی، لیکن نہ اس مسکراہٹ میں خوشی تھی نہ غم، یوں جیسے وہ بے مقصد ہو۔

سریش نے الجھن زدہ نگاہوں سے اس تھیلے کے اندر جھانکا تو اندر کا سامان دیکھ کر وہ چونک گیا اور مشکور ہو کر یاسمین کو دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں نم ہوئیں اور وہ تیزی سے یاسمین سے لپٹ گیا اور ایک بار پھر سے رونے لگا۔ اس نے اسے کھل کر رونے کی اجازت دی اور اس کی پیٹھ تھپتھپاتے گئی۔

اور ہاں..... یاسمین کا چہرا اب بھی بلا تاثر تھا۔

.....☆☆☆.....

"ان کو کھانے کے بعد مجھے اس بیکری کی مالکن سے ملنا کا اشتیاق ہوا۔ کیا ہے کہ اس بیکری کی مالکن کا متعدد مرتبہ ذکر سن چکا ہوں۔ لوگ تو کہتے تھے کہ، وہ کوئی بہت ہی شفیق اور ہمدرد خاتون ہیں۔

لیکن نہیں، نہیں۔ اس بیکری کی مالکن وہی تھی۔ وہی لڑکی جس نے میرا انتہائی "گرم جوش" استقبال کیا۔ خدارا اگر وہ شفیق اور ہمدرد ہے تو میں کسی ظالم سے ملنا نہیں چاہوں گا۔ میری تو بس ہو گئی تھی۔ میں نے اسی وقت خود سے عہد کیا کہ آئندہ وہاں نہیں جاؤں گا۔ لیکن میں خود سے باخبر ہوں اور یہ بات جانتا ہوں کہ کل اس بیکری کا پہلا گاہک میں خود ہوں گا۔

میں جانتا ہوں میرا یہ دل مجھے بہلائے گا، پھسلائے گا، مجھ سے کہے گا کہ البرٹ، تمہیں تو کھانے پینے سے غرض ہونا چاہیے نا؟ اس لڑکی کے برتاؤ سے تمھارا کیا لینا دینا۔"

.....☆☆☆.....

"آپ ایسے نہ روئیں سریش۔ آپ کی والدہ کو آپ کی ضرورت ہے۔ اگر آپ ہی یوں ڈھے جائیں گے تو انہیں کون سنبھالے گا؟ کبھی سوچا ہے؟" وہ اسے خود سے جدا کرتے نرمی سے بولی۔

سریش نے گیلی سانس اندر کھینچتے خود کو رونے سے روکا۔

"کیا کروں آپی؟ آپ ہی بتائیں۔ پتاجی کو ناحق مارا تھا۔ کیا پچھلے سال جو ہزاروں لوگ مرے تھے کیا انہیں مرنا چاہیے تھا؟ ہم کب تک یوں ہی بے بس اور قید رہیں گے۔ ان لوگوں کے ہاتھوں دبتے رہیں گے؟ کیا اس سانحے کے بعد کچھ بھی پہلے جیسا ہو سکتا ہے۔"

اب کی بار تو یاسمین کے دل کو ایسی ضرب لگی کہ بمشکل اس نے آنسوؤں کو آنکھوں میں چھلکنے سے روکا۔ وہ سچ ہی تو کہتا تھا، پچھلے سال کی انہونی آخر کوئی کیسے بھلا سکتا تھا؟ وہ تو ان سب کے وجود زخم خوردہ کر گئی تھی۔ زخم، جو مہلک ثابت ہو رہے تھے۔ جو بار بار رگڑ کھاتے اور تکلیف کا سبب بنتے تھے۔

"ہمیں ایک دن آزادی ضرور ملے گی۔" وہ بلا تاثر بولی۔ "ابھی آپ گھر جائیں۔ آپ کی والدہ پریشان ہوں گی۔" وہ بدستور بے مقصد سا مسکرائی۔ اب سریش گردن اوپر نیچے ہلاتے، ہاتھ میں وہ تھیلا تھامے جانے لگا۔

وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہوا تو اس کے کندھے شل پڑے۔ آنکھوں میں بے بسی اور افسردگی کی لہر ابھری۔ اس کی روح کو ایک شناسا سے کرب نے جکڑ لیا۔ وہ سرد، ہاری ہوئی سانس خارج کرتے کھڑی ہوئی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کی ساری توانائی نچڑ گئی ہو۔ اس نے گردن موڑ کر گھر کے باہر لگی کیاری کو دیکھا۔ اس پر سفید یاسمین کے پھول لگے ہوئے تھے۔ وہ محویت سے انہیں کچھ دیر تکتے گئی۔

پھر اپنی گردن کا رخ موڑ کر آنکھیں بند کر کے رنج کو اپنے اندر اتارا۔

.....☆☆☆.....

"نہ جانے کیوں میرا دماغ اب بھی ان آنکھوں میں اٹکا ہوا ہے۔ مجھے یہی گمان رہا ہے کہ میں آنکھوں کو پڑھنے کا ہنر جانتا ہوں، لیکن ان آنکھوں نے مجھے غلط ثابت کیا۔ ان آنکھوں میں سفاکی کے علاوہ بھی کچھ تھا۔ لیکن کیا؟ کچھ تھا جو وہ آنکھیں چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ تکلیف؟ محرومی؟ بے بسی؟ یا شاید تینوں؟

وہ سیاہ آنکھیں نہایت گہری تھیں اور اتنی گہرائی میں اترنا شاید میری استطاعت میں نہیں تھا۔ اور یوں ایک دلچسپ دن کا اختتام ہوا۔ ان بسکٹ کا ذائقہ اب بھی میری زبان پر موجود ہے۔ اب آگے دیکھتے ہیں کہ چمنِ گلاب کی سوغات ان بسکٹس جتنی لذیذ ثابت ہوتی ہیں کہ نہیں۔"

ہاتھ سے قلم چھوٹ گیا۔ رفتہ رفتہ وہ دنیا میں واپس آنے لگا۔ جسم مسرور تھا۔ دن بھر کی تکان، اتر چکی تھی۔

.....☆☆☆.....

اس نے گھر کی ویرانی میں قدم رکھا، جس کی فضا اسے ثقیل محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے بمشکل اپنے آپ کو صوفے تک گھسیٹا۔

صوفے پر بیٹھ کر اس نے میز پر پڑا لال ٹین جلایا۔ زرد روشنی پورے کمرے میں پھیلی۔

گھر میں اداسی کا بسیرہ تھا۔ کچھ دیر وہ اس جلتے لالٹین کو دیکھتی گئی۔ اس کی آنکھوں میں لرزش آئی۔ دل ڈوب کر ابھرا اور کسی آبگینے کی طرح ٹوٹ گیا۔

چکنا چور۔

کرچی کرچی۔

اس کا وجود شل ہو کر صوفے پر ڈھے گیا۔ روح، اس لالٹین کی مانند جلنے لگی۔

اس کی وہ سرد بلا تاثر آنکھیں سرد نہ رہی تھیں، بلکہ وہ کوئی گہرا غم مناتی نظر آ رہی تھیں۔ ان کے پردوں پر بے بسی تھی، لاچارگی تھی۔ آنکھوں سے آنسو رواں ہوئے اور اس کے گالوں پر سے اپنی راہ بناتے، صوفے پر جذب ہو گئے۔ چھت کو دیکھتے ہوئے، اس کی آنکھوں میں التجائیہ تاثر ابھرا۔

"یا اللہ!" بے بسی سے موزوں آواز، جس میں کپکپاہٹ تھی، لرزش تھی۔ کہاں چلے گئی تھی اس کی آواز کی پختگی؟ کوئی کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی یاسمین تھی، چمنِ گلاب کی کٹھور، سنگ دل مالکن؟

"یا اللہ ہمارے اوپر رحم کر!" اب اس کی آواز بلند ہوئی اور اس میں تڑپ شامل ہوئی۔

ایک بار پھر اس نے گردن جھکالی اور بدستور روتے گئی۔

سرد مہر، سفاک اور سنگ دل یاسمین، جو دنیا کے سامنے کسی تناور چٹان کی طرح تھی، وہ درحقیقت اس قدر حساس تھی کہ ایک بچے کے آنسوؤں نے اس کا ہر زخم خرچ دیا تھا۔

یہ تھی سیدہ یاسمین مجاہد!

.....☆☆☆.....

انسان کی زندگی شاید تھم سکتی ہے۔ وہ اپنے غموں میں غرق ہو کر خود کو کھو سکتا ہے۔ لڑنے کی ہمت کھو سکتا ہے۔ لیکن یہ دنیا اس کے لیے نہیں تھمتی۔ یہ دنیا اسے مہلت نہیں دیتی۔ وقت گزرتا ہے۔ رات کی تاریکی کا دم گھٹتا ہے اور سورج نئے سرے سے طلوع ہوتا ہے اور روشنیوں کو جنم دیتا ہے۔

سورج کی کرنیں چمنِ گلاب کی اس عمارت پر جلوہ افروز تھیں۔ البرٹ کی سائیکل، آج بھی عمارت کے باہر کھڑی تھی۔

وہ ایک گول میز کے گرد کرسی پر براجمان، اخبار پڑھنے میں محو تھا، جب کہ ساری ملازمائیں شدید گھبراہٹ میں مبتلا تھیں۔

یکبارگی دروازہ کھلا تو' جہاں تمام خواتین کے چہرے فق ہوئے وہاں البرٹ نے اخبار نیچے کر کے گردن موڑ کر اسے اندر داخل ہوتے دیکھا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس کی چال پھرتیلی اور رعب دار تھی۔

یاسمین نے پہلے سب کی گھبراہٹ کا جائزہ لیا۔ گندمی ماتھا تفتیش آمیز لکیروں سے بھرا۔ اس نے دائیں جانب دیکھا اور میز کو خالی پا کر اس کا خون کھول اٹھا۔ اس کی نظروں نے اب بھاری بھرکم روشی کا تعاقب کیا جو اپنی گردن جھکانے سے بمشکل خود کو روک رہی تھی، البتہ نظریں ملانے کی اب بھی اس میں ہمت نہ تھی۔

"روشی۔" ہموار مگر پر تپش آواز اور پر تحکم، برفیلہ لہجہ۔ کیا انداز تھے اس لڑکی کے!

البرٹ کی شہد رنگ آنکھیں غور سے اس لڑکی کو پرکھ رہی تھیں۔ آخر یاسمین اس خطاء پر روشی کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنے والی تھی؟ مار ڈالے گی یا بیکری سے نکال دے گی۔

روشی سست سست قدم بڑھاتے یاسمین کے مقابل کھڑی ہو گئی۔ اب بھی اپنی مالکن سے نظریں ملانے کی ہمت نہ ہوئی۔

"تاخیر ہو گئی تھی یاسمین صاحبہ۔ اب تو معذرت کرتے ہوئے بھی اپنا آپ گرا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔" اس کی آواز میں شفاف ندامت جھلک رہی تھی، لیکن کیا اس ندامت کا یاسمین کے دل پر کوئی اثرِ خاص ہوا بھی تھا؟ اس کے پتھریلے چہرے سے اندازہ لگانا، ناممکن تھا۔

"آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرو۔ زیادہ سے زیادہ ہم تمہیں نکال ہی دیں گے؟ چلو۔" وہ گردن اکڑا کر، اپنے ہاتھ پشت پر باندھتے بولی۔

بیکری کی تمام ملازمائیں بشمولیت البرٹ اس منظر کو سانسیں تھام کر دیکھ رہی تھیں۔ اب آگے کیا ہو گا، یہ گفتگو کس رُخ جائے گی، کوئی واقف نہ تھا۔ بیکری کا ماحول پر اسرار ہوا چلا تھا۔

روشی نے ہمت مجتمع کرتے اپنی نظریں اٹھائیں اور اپنے لرزتے دل کو ضبط کے کڑوے گھونٹ پلاتے، یاسمین کی خونخوار آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ وہ آنکھیں جیسے اسے اندر سے کاٹ رہی تھیں۔

"اب تم ہمیں بتاؤ۔ کوئی خاص وجہ ہے اس تاخیر کی؟" وہی سرد انداز۔

روشی کے بولنے سے قبل لب کپکپائے۔ اسے خوف وہراس نے گھیر لیا تھا۔

"میرا بچہ رات میں سونے سے قبل بہت پریشان کرتا ہے جس کے باعث میری نیند پوری نہیں ہوتی اور یوں تاخیر ہو جاتی ہے۔" وہ لرکھڑاتی آواز لیے گویا ہوئی۔

"کب سونے جاتی ہو؟" اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ غصے میں تھی یا نہیں۔

"ساڑھے دس بجے۔" آواز پہلے سے قدرے ہموار تھی۔ شاید اب ان نظروں میں پنپتی دہشت کی، عادت پڑنے لگ تھی۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے کہہ کر پیچھے کھڑی ملازماؤں پر نظر دوڑائی۔ بالآخر ایک ملازمہ پر اس کی نگاہ رک گئی۔

"عمارہ!" وہ اونچی آواز میں بولی تو عمارہ نامی، دبلی پتلی ملازمہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"تمھارے بچوں کی عمر کیا ہے۔"

"ایک دس کا ہے اور ایک بارہ کا۔" اس کے لہجے میں یاسمین کے لیے احترام تھا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے گردن پھر سے روشی کی جانب موڑی، جس کا دل اب بھی برق رفتاری سے دھڑک رہا تھا۔ نہ جانے چمنِ گلاب کی ملکہ اس کے حق میں کیسا فیصلہ لینے والی تھی۔

"روشی تم چابی عمارہ کے حوالے کر دو۔ اور ہاں' رات میں کھانا جلدی کھا کر ساڑھے دس کے بجائے ساڑھے نو تک بستر پر چلے جایا کرو۔ کم از کم تمھاری نیند تو پوری ہو گی۔ ہمیں پہلے بھی تم متعدد مرتبہ انگڑائیاں اور جمائیاں لیتی نظر آئی ہو، جو کہ قابلِ قبول نہیں۔" استحکام سے موزوں لہجے میں کہتے وہ قدم باورچی خانے کی جانب بڑھانے لگی۔ اس کی چال میں شانِ استغنا قائم تھی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے باورچی خانے کا دروازہ کھل کر بند ہوا اور وہ اس میں گم ہو گئی۔

جہاں ملازماؤں کی سانسیں بحال ہوئیں وہاں البرٹ کی بھی جیسے اٹکی سانسیں باہر نکلیں۔ کیسا سحر تھا اس کی شخصیت میں کہ اس کی موجودگی میں ہر فرد کی سانسیں اٹک جایا کرتی تھیں۔

البرٹ نے بظاہر اپنی گردن اخبار میں جھکا لی تھی، مگر اب وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس لڑکی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ایک بات پر تو اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ لڑکی اندر سے اتنی سنگدل نہ تھی جتنی بظاہر نظر آتی تھی۔

دوسری طرف، بھاری بھر کم روشی کا چہرا سُرخ انگارے کی مانند دہک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں، چمنِ گلاب کی ملکہ کے لیے ناپسندیدگی واضح تھی۔

.....☆☆☆.....

کیکس، بسکٹس اور بریڈ سے لدی ٹریز کے باورچی خانے سے باہر نکلنے کی دیر تھی کہ وہ خوبصورت و دلفریب مہک بیکری میں بکھرتی چلی گئی۔

اخبار تہہ کر کے میز پر رکھتے ہوئے، البرٹ نے آنکھیں بند کیں اور اس مہک کو اپنے اندر اتارا۔ یہ خوشبو کسی نشے سے کم نہ تھی۔ ہمیشہ کی طرح، وہ اس کے لیے تر و تازگی کا سامان بنی تھی۔

بغیر کسی تاخیر کے، وہ کھڑا ہوا اور اپنے لیے بادام کے کیک کا سلائیس لے آیا۔

وہ جوں کے توں بادام کے کیک کے سلائس کو دیکھتا رہ گیا۔

اس سلائیس کی خوبصورتی دیکھ کر اسے حیرت نے گھیر لیا تھا۔ کیک کی سنہری سطح پر الائچی کے شیرے کا چھڑکاؤ کیا گیا تھا، جس کی بدولت وہ چمک رہی تھی۔ ادھ کٹے باداموں سے اس پر نقش بنائے گئے تھے۔

کیک اس قدر نرم تھا کہ چمچ سے ہلکی سی ٹکرار کے بعد ہی کسی اعلیٰ معیار کی مکھن کی ٹکیہ کی طرح ٹوٹ گیا۔ البرٹ کے منہ میں پانی بھر آیا۔ وہ کیک اس کی کافی صبر آزمائی کر گیا تھا۔

بالآخر، کیک کا وہ ٹکرا اس نے اپنے حلق میں اتارا اور اسے ایسا محسوس ہوا، جیسے اس کی روح عرش تک پہنچ گئی ہو۔ دماغ میں سرائیت کی لہر دوڑی اور سر ہلکا پھلکا ہونے لگا تھا۔

اور یہ وہ وقت تھا جب البرٹ کو یقین آ گیا تھا کہ چمنِ گلاب میں صرف بیکنگ نہیں ہوتی تھی، وہاں جادو ہوتا تھا۔ اور یہاں کی ملازمائیں کسی ساحرہ سے کم نہ تھیں۔

ایک سلائس کھانے کے بعد اس کا دل بری طرح للچایا اور اس نے دوسرا سلائس بھی خرید لیا، یہی سوچ کر کہ برطانیہ میں اسے اس قدر لذیذ کیک کہاں ملنے والے تھے۔ ہاں! یہ بات اس کے لیے قدرے افسوس ناک بھی تھی۔

اگرچہ وہ لڑکی ذرہ برابر خوش اخلاق ہوتی، تو وہ اس سے ترکیب پوچھ لیتا۔ لیکن اتنا ڈرتو اسے ہندوستان کے پہلوانوں سے نہ لگا، جتنا اس بھورے بالوں والی لڑکی سے لگتا تھا۔

وہ کچھ لمحے اپنی زبان پر وہ ذائقہ رقم کیے اخبار پڑھنے لگا۔ وہ اخبار پڑھ تو رہا تھا لیکن اس کے کان آس پاس کے ماحول سے باخبر تھے۔ وہ ایک لکھاری جو ٹھہرا تھا۔ ہر جگہ وہ غیر دانستہ طور پر ہی غور و فکر کرتا تھا۔

اسے گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی، اور گھوڑوں کی وہ مخصوص ہنہناہٹ جو بگھی کے رکنے پر پیدا ہوتی ہے۔ یعنی باہر بگھی کھڑی تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا، تو اسے یاسمین عجلت میں بیکری سے باہر جاتی، اور دوبارہ اندر آتی نظر آئی۔ اس کے ماتھے پر مصروفیت کے بل نمودار ہو رہے تھے۔

"گل ناز!" وہ اونچی آواز میں بولی تو گل ناز نامی ملازمہ بھاگی بھاگی آئی۔

"رشید اب تک نہیں آئے، لیکن بگھی آچکی ہے۔ تم انہیں بلا وہ دے آؤ۔" مصروف سے انداز میں اس نے ہدایات پیش کیں تو گل ناز سر کو خم کے باہر بھاگی۔ وہ وہیں پر کھڑی، گل ناز کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔

دفعتاً گل ناز واپس آئی، تو چمنِ گلاب کی ملکہ نے اسے پر امید نظروں سے دیکھا۔

"یاسمین صاحبہ، کل رات ان کی ٹانگ پر کسی کتے نے کاٹا ہے۔ طبیعت ناساز ہے اور اگلے دو سے تین ہفتے تک صحتیابی کی کوئی امید نہیں۔"

خبر سنتے ہی یاسمین کے وجود میں انتشار پھیل گیا۔

"یا اللہ۔" آنکھوں کی پتلیاں پھیلیں۔ وہ ہاتھ آپس میں مسلنے لگی۔ "آج جمعہ ہے۔ ہماری بہنیں ہمارا انتظار کر رہی ہیں۔" اس کے ماتھے پر مزید سلوٹیں اجاگر ہوئیں۔

البرٹ صورتحال کو بھانپ کر اخبار بند کرتے کھڑا ہوا اور ان دونوں کی جانب بڑھا۔ جہاں گل ناز اپنا چہرہ ڈھانپتے دور جانے لگی، وہاں یاسمین متحمل ہو کر اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

"سب خیریت ہے؟ اگر آپ لوگوں کو کسی بھی طرح کی مدد کی ضرورت ہو، تو میں حاضر ہوں۔"

یاسمین نے اس قد آور مرد کو ایک مرتبہ اوپر سے نیچے دیکھا۔ وہ اسے ویسا ہی لگا جیسے تمام برٹش دکھائی دیتے تھے، کم از کم اسے تو سب ایک جیسے لگتے تھے۔ وہی کوٹ پینٹ، سر پر ہیٹ، بھری ہوئی مونچھیں۔ ہاں ایک چیز جو اس میں کچھ مختلف لگی وہ اس کی شہد رنگ آنکھیں تھیں۔ نہیں نہیں، ان آنکھوں کی رنگت مختلف نہ لگی تھی، لیکن اکثر برٹش کے برعکس ان آنکھوں میں دبی دبی تضحیک نہ تھی۔

"نہیں۔ ہم کوئی نہ کوئی راہ دریافت کر لیں گے۔ ہم گاہکوں سے کام لینے کے عادی نہیں۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔ "آپ اپنی جگہ پر بیٹھ سکتے ہیں۔" اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا، تو البرٹ اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

وہ کبھی بھی کسی برٹش سے مدد لینے پر آمادہ نہیں ہو سکتی تھی۔ کبھی نہیں!

"عمارہ، روشی اور گلناز۔ آپ لوگ سامان لے کر آئیں، ہم اکیلے ہی جائیں گے۔" اس کی بات سن کر تینوں ملازماؤں نے ایک دوسرے کو کوفت کی عالم میں دیکھا۔

"لیکن یاسمین صاحبہ۔" عمارہ نے بولنے کی ہمت کی۔ راشن کی بوریاں وزنی تھیں، ان تینوں کی حالت پتلی ہو جانی تھی۔ "آپ بگھی بان سے بھی مدد لے سکتی ہیں۔" اس نے کہہ کر آنکھیں میچ لیں۔ نہ جانے وہ کس عافت کو دعوت دے چکی تھی۔

یاسمین کی پریشانی میں ڈوبی آنکھوں میں اشتعال کی رمق ابھری۔

"اگر کام نہیں کرنا تو ہمیں صاف لفظوں میں بتایا جائے۔ آپ سب نے بگھی بان کی عمر دیکھی ہے؟ کیا ہمارے دماغ میں یہ خیال نہیں آیا ہو گا؟" وہ طیش میں عمارہ کے اوپر برس پڑی۔

ان تینوں کی ہاری ہوئی نظروں کا تبادلہ ہوا اور وہ باورچی خانے میں برے دل کے ساتھ گئیں۔

البرٹ سب غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کو اندر ہی اندر ہنسی بھی آ رہی تھی۔ تو یعنی یاسمین صاحبہ اپنی ضد کے عوض، اپنی بے چاری ملازماؤں پر ظلم ڈھانے والی تھیں۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

"ایک کام کریں۔ مجھے اس کام کا معاوضہ دے دیجیے۔ یوں آپ پر بھی یہ بات گراں نہ گزرے گی۔" اس نے مسکرا کر پیش کش کی۔

یاسمین کے ماتھے پر پر سوچ لکیر ابھری۔ وہ اس کی مسکراہٹ کے فریب میں آنا نہیں چاہتی تھی۔

"ضرورت نہیں۔" صاف انکار کیا تو البرٹ نے بے نیازی سے کندھے اچکا دیے۔

کچھ دیر بعد تینوں لڑکیاں ایک بوری باہر لائیں۔ بوری دروازے تک پہنچی بھی نہ تھی کہ ان کی حالت پتلی ہو گئی اور وہ زمین پر ڈھے کر اونچی اونچی سانسیں لینے لگیں۔ یاسمین کا ضبط بس ٹوٹنے لگا تھا۔

"تم لوگ چھوڑو۔ ہم اکیلے ہی کر لیں گے۔" خفگی سے کہتے وہ بوری اٹھانے لگی۔ بوری واقعتاً بہت بھاری تھا۔ اسے تو حیرت ہونے لگی کہ رشید یہ پر مشقت کام اتنی آسانی سے کیسے کر لیتا تھا۔

وہ ہاری ہوئی سانس خارج کرتے اس بوری کو دیکھنے لگی۔

"ضد چھوڑ دیں لیڈی۔ آپ ہی کی آسانی کے لیے کہہ رہا ہوں۔" وہ پر سکون سے انداز میں اخبار میں نظریں گاڑتے بولا، جیسے یاسمین کے ہاں یاناں سے اسے خاص فرق نہ پڑتا ہو۔

یاسمین کو وہ آدمی بری طرح کھل رہا تھا۔

"بتائیں۔ ڈال دوں سامان بگھی میں؟" اخبار نیچے کرتے اس نے یاسمین کو دیکھا اور مدہم سا مسکرا دیا۔

یاسمین نے اس پر مشکوک نگاہ ڈالی۔ پھر ایک کوفت آمیز نگاہ اس بوری پر۔ ایک ہاری ہوئی سانس خارج کرتے اس نے البرٹ کو دیکھا جیسے اپنی ہار تسلیم کر چکی ہو۔

چہرے پر ناگواری لیے اس نے گردن ہاں میں ہلا دی۔ البرٹ زیر لب ہنس کر کھڑا ہوا، اور خود کو کام کے لیے تیار کرنے لگا۔

باورچی خانے میں بیس کے قریب بوریاں تھیں۔ البرٹ ایک ایک بوری کو باہر لے کر جاتا اور بگھی میں منتقل کرتا۔ یوں پینتالیس منٹ کی مشقت کے بعد، سارا سامان بگھی میں منتقل ہو گیا۔

وہ باہر کھڑے ہو کر بگھی کو دیکھ رہا تھا اور یاسمین اس کے پیچھے کھڑی، آنکھوں میں ترحم سا تاثر لیے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ پسینے میں بھیگ گیا تھا اور سانسیں بھی پھول رہی تھیں۔ اس کے باوجود وہ مسکرا رہا تھا۔ نہ جانے کیوں، یاسمین کو اس مسکراہٹ سے چڑ ہونے لگی تھی۔ شاید اس کے چہرے کا زاویہ ہی کچھ یوں تھا کہ وہ ہمیشہ مسکراتا نظر آتا تھا۔

"اور کچھ۔" وہ ماتھے پر ابھر تا پسینہ ہاتھ کی پشت سے پونچھتے بولا تو یاسمین کی آنکھیں شرمسار ہوئیں۔

"اگر، اگر، اگر۔ آپ کے پاس وقت ہو تو کیا آپ ہمارے ساتھ چل سکتے ہیں۔ ہمیں یہ بوریاں جگہ جگہ اتارنی بھی ہیں۔" صاف ظاہر تھا کہ وہ دل پر پتھر رکھ کر اور اپنی انا کا خون کر اس سے درخواست کر رہی تھی۔

"اگر آپ کی دوسری مصروفیات ہیں تو ہمیں انکار کر سکتے ہیں۔" وہ اس سے نظریں چرانے لگی۔

البرٹ اس کی بات پر محض مسکرا دیا۔ وہ پورا ہندوستان گھوم چکا تھا۔ یوں اس کی موجودگی میں ہندوستانیوں کا عدمِ تحافظ کا شکار ہونا اس کے لیے عام سی بات تھی۔ اس نے ایک بات اخذ کی تھی کہ ہندوستانی برطانوی شہریوں پر اعتبار کرنے سے کتراتے ہیں۔

"کیوں نہیں۔ میں تو ویسے بھی ایک لکھاری ہوں۔ دن بھر کے تجربات رات کو اپنے قلم کے ذریعے کاغذ کے سپرد کر دیتا ہوں۔" وہ جتنی بد اخلاق اور روکھی تھی وہ اتنا ہی گرمجوش اور خوش اخلاق واقع ہوا تھا۔

یاسمین پھیکا سا مسکرائی اور دوسری بگھی میں چڑھ گئی۔ البرٹ بھی اس کے ہمراہ بگھی میں سوار ہو گیا۔

وہ بگھی کے کناروں سے چپک کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے پرس کو کستی سے گود میں جکڑا ہوا تھا۔ حواس چوکنّا تھے اور آنکھیں محتاط۔

گھوڑے ہنہنائے۔ بگھی امرتسر کی تنگ گلیوں میں دوڑتے ایک گلی سے دوسری گلی کی سیر کرتی۔ اور یوں وہ ایک کالونی سے دوسری کالونی جاتے اور گھر گھر رکتے۔

پہلے یاسمین اتر کر دروازے پر دستک دیتی۔ اس کا استقبال کرنے، ہمیشہ کوئی نہ کوئی عورت رونما ہوتی تھی۔ یاسمین کو دیکھتے ہی ان کے چہروں پر تشکر آمیز تاثر ابھرتا۔

البرٹ سب کچھ غور سے دیکھ رہا تھا اور ایک بات جو اس کے دماغ میں لگی تھی، وہ یہ کہ یاسمین کا چہرا ہمیشہ پتھریلا ہی رہتا۔ سامنے والا چاہے خوشی سے اچھل کود شروع کر دے لیکن وہ ساکت رہتی۔

ہر گھر کے دروازے پر راشن کی بوریاں رکھنے کا کام البرٹ کا تھا۔ اس نے ایک چیز پر مزید غور کیا تھا کہ ہر کوئی اسے گھور گھور کر کچھ اس طرح دیکھتا جیسے وہ کوئی ہوائی مخلوق ہو۔ اس عمل سے اسے کوفت محسوس ہونے لگی تھی۔

یہ تب کی بات ہے جب دوپہر ڈھلنے کو تھی اور آدھے سے زیادہ بوریاں گھروں میں پہنچا دی گئی تھیں۔

البرٹ بگھی سے بوری گھسیٹ ہی رہا تھا جب اسے یاسمین اور ایک عورت کی گفتگو سنائی دی۔

"یاسمین۔ یہ تمھارے ساتھ انگریز کیا کر رہا ہے؟" وہ سرگوشی کر رہی تھی لیکن البرٹ کے کان ضرورت سے زیادہ تیز تھے۔

"رشید کی طبیعت ناساز ہے، ہمارے پاس کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔" یاسمین کی آواز بلا تاثر تھی۔

"پھر بھی احتیاط کیا کرو۔"

البرٹ نے بے دلی سے بوری کندھے پر لاد دی۔ ہندوستانی خواہ ہی باتیں گڑھتے تھے کہ برٹش مغرور ہوتے ہیں، یہاں تو ہر ایک شخص اسے تحقیر سے دیکھتا تھا، نفرت سے دیکھتا تھا۔ پھر مغرور کون ہوا؟

"خیر۔ جنت، آپ یہ رکھیں۔" یاسمین نے اپنے پرس سے چند سکے نکالے اور جنت کے ہاتھ میں تھما دیے۔ جنت نے انہیں تھامتے گردن نفی میں ہلائی۔ آنکھوں میں نمی اتری۔ وہ بے ساختہ ہو گئی تھیں۔

"نہیں یاسمین۔ تم جو ہم بیواؤں اور لاچار عورتوں کے لیے کر رہی ہو، یہی کافی ہے۔ اس سے زیادہ میں ایک کوڑی نہیں لوں گی۔ میرا ضمیر مجھے اس بات کی اجازت نہیں دے گا۔" جنت کی آواز اب کہ نم تھی۔

البرٹ اس سب میں بس یاسمین کے چہرے کو تک رہا تھا جو کہ ہمیشہ کی طرح بلا تاثر رہا۔ اس کو تعجب ہوا کہ وہ ہمیشہ سے ہی ایسی تھی یا حالات نے اسے ایسا بنا دیا تھا؟

"اس میں ایسا کیا ہے جو آپ کا ضمیر اجازت نہیں دے رہا۔ یہ تو احمد اور حماد کے لیے ہے۔ ان کی سالگرہ ہے نا اس ہفتے۔ اب وہ ہمارے بھانجے ہوئے تو اتنا تو ہم کر سکتے۔" اس نے نرمی سے ہاتھ جنت کے ترگال پر رکھا جیسے انہیں منا رہی ہو۔ آنکھیں اب بھی سرد تھیں۔

"مجھے ڈر لگتا ہے یاسمین۔۔۔" وہ بولتے بولتے رک گئیں۔ جیسے وہ جانتی ہوں، کہ جو وہ بولنے والی تھیں، اس سے اس بھورے بالوں والی لڑکی کا دل بری طرح سے ٹوٹ جائے گا۔

یاسمین نے مایوس کن سانس خارج کی جیسے ان کا جملہ وہ بوجھ چکی ہو۔ اس نے جنت کو کندھوں سے جکڑا۔ آنکھوں میں پل بھر کو نرمی سی اتری۔

"اگر آپ کو یہ اندیشہ ہے کہ سیدہ یاسمین مجاہد اپنی بہنوں کو بے سہارا چھوڑ دے گی، تو آپ سراسر غلط ہیں۔ ہاں، ہماری آپ سب سے خونی وابستگی نہیں۔ لیکن، جانتی ہیں ہمیں کون سی شے اٹوٹ بندھن میں باندھتی ہے؟ ہمارا دکھ درد سانجھا ہے!

اور جب تک ہمارے جسم میں سانسوں کی روانی ہے، ہم اس بندھن کو نبھانے کے قائل ہیں۔ آئندہ کبھی بھی یہ خیال آپ کے ذہن کے در کھٹکھٹائے تو اسے جھڑک دیجئیے گا۔" اور جتنی تیزی سے اس کی آنکھوں میں نرمی اجاگر ہوئی تھی اتنی ہی تیزی سے فنا بھی ہو گئی۔

البرٹ کندھے پر بوری لادے بس اسے دیکھتا گیا۔ اب کہ وہ لڑکی اسے پہلے سے بھی زیادہ دلچسپ لگی۔

کون سے غم ہوں گے، جو انہیں ایک کرتے ہوں گے؟ نہ جانے یہ ہندوستانی اس قدر خود ترسی کا شکار کیوں تھے؟ اس نے دل ہی دل میں سوچ کر سر جھٹکا اور لاپرواہی سے بوری دروازے پر رکھ دی۔

جیسے تیسے یہ دن بھی گزر گیا۔ کام ختم کرتے، رات بیت گئی تھی۔ وہ دونوں بگھی میں سوار تھے اور واپسی کے راستے پر گامزن تھے۔

"ایک سوال پوچھنے کی اجازت مل سکتی ہے۔" ادب سے کہتے اس نے دونوں کے درمیان حائل خاموشی کو توڑا۔

صبح کے برعکس یاسمین پرسکون اور پراطمینان تھی۔ وہ حواس چوکنّا نہ کیے ہوئے تھی، نہ ہی آنکھوں میں ساختگی تھی۔

"جی۔" اس نے گہری سانس خارج کرتے جواب دیا۔

اس کے انداز کی اب البرٹ کو عادت ہو چکی تھی۔

"یہ سب کس مشترکہ تکلیف کی بات کر رہے تھے؟ کیا میں جان سکتا ہوں۔"

یاسمین نے سست روی سے گردن گھمائی اور البرٹ کی متجسس آنکھوں میں اپنی پتھریلی نگاہ گاڑی۔

"ہم سب کے گھروں میں والی وارث نہیں۔ کچھ نے اپنے باپ، بیٹے اور شوہروں کو عظیم جنگ میں گنوا دیا ہے تو کچھ نے۔۔۔" کہتے کہتے اس کی آواز اٹکی۔

البرٹ کو پہلی مرتبہ اس کی آواز کی گہرائیوں میں کرب سنائی دیا۔

نہیں، البرٹ نے سوچ کر جھٹکا، یہ پہلی مرتبہ نہیں تھا۔ اس کی آواز میں ہمیشہ سے کرب جھلکتا تھا۔ جسے وہ مہارت کے ساتھ سرد مہری کے ذریعے ڈھانپنے کی کوشش کرتی تھی۔

"اور کچھ نے انہیں جلیاں والا باغ کے سانحے میں گنوا دیا۔" اس کی آواز بھلے نم تھی لیکن آنکھیں سوکھی، ویران اور خالی تھیں۔ وہ جیسے خود سے جنگ لڑ کر اپنے آنسوؤں کو آنکھوں میں منڈلانے سے روک رہی تھی۔

البرٹ اسے شاک کے عالم میں دیکھتا گیا۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہوئے۔ آخر کیا ہو گی یاسمین کی کہانی؟ یہ سوال اسے ذہنی خلفشار میں مبتلا کر گیا۔

"سن کر افسوس ہوا۔" وہ گردن موڑتے، اپنی غم زدہ آنکھوں کو جھکاتے بولا۔

اس بات پر یاسمین طنزیہ سا مسکرا دی۔

"جان کر اچھا لگا۔"

اس کا انداز البرٹ کو بہت برا لگا۔ اس کا دل دکھی ہو گیا تھا۔ وہ ایسے طنز کیوں کر رہی تھی جیسے یہ ظاہر کرنا چاہ رہی ہو کہ، اسے البرٹ کے افسوس پر یقین نہیں؟ البرٹ نے باقی کا سفر خاموشی سے کاٹا۔

بگھی اس گلی کے پاس ٹھہری جہاں یاسمین کا گھر واقع تھا۔

"کل صبح آ کر معاوضہ لے جایئے گا، مسٹر۔۔۔"

"البرٹ۔" گزشتہ تلخ کلامی کو نظر انداز کرتے، اس نے مسکرا کر اپنا نام بتایا۔

"اور آپ کا نام؟" وہ نام سن چکا تھا لیکن اب خود اس کے لبوں سے سننا چاہتا تھا۔

"یاسمین مجاہد۔ سیدہ یاسمین مجاہد!" گردن اکڑا کر وہ ایک شان سے بولتے، بگھی سے اتری اور گلی میں کہیں گم ہو گئی۔ بگھی چل پڑی اور وہ ایک بار پھر سے سوچوں میں غرق ہو گیا۔

اس لڑکی کے تعصب آمیز نظریات سے اسے بھلے سے شدید اختلاف تھا، لیکن ایک بات کا تابع وہ ہو چکا تھا کہ وہ لڑکی بالکل ویسی نہ تھی جیسا خود کو ظاہر کرتی تھی۔

.....☆☆☆.....

بگھی سرائے کے باہر رکی تو اس نے اپنا بوجھل اور تھکان زدہ جسم باہر نکالا۔ آنکھیں بمشکل کھول کر وہ سرائے میں داخل ہوا اور جیا کی خالی میز کے گرد بیٹھ گیا۔ کچھ دیر گردن ڈھیلی چھوڑ کر اپنے کندھے کے پٹھوں کو کھینچنے لگا۔ تکان میں تخفیف آئی تھی۔

دفعتاً سرائے کے عملے کا عبدالمجید اس کے پاس سے گزرا۔ البرٹ کو دیکھتے ہی، وہ رک گیا۔ اپنے قیام کے دوران، البرٹ نے ہر ایک سے ہی اچھی بنالی تھی۔

"کیسے ہو البرٹ؟" وہ اسے دیکھ کر چہکا، تو البرٹ نے آنکھیں کھول کر گردن اٹھائی۔ "کچھ تھکے تھکے لگ رہے ہو۔"

"ہاں۔ کام کے چکر میں پورا امرتسر گھوم لیا۔"

یکدم اسے یاسمین کا کرخت چہرا یاد آیا، یاسمین کی وہ آواز یاد آئی جس میں کچھ دیر قبل اس نے کرب بھانپا تھا۔ اس کے لبوں سے ادا ہوا، ایک ایک لفظ اس کے ذہن کے خانوں میں چکر کاٹ رہا تھا۔

"خیر، کچھ کھانے کو لاؤں؟" عبدالمجید نے خوش دلی سے پیش کش کی۔

"جی۔ اور اپنے لیے بھی لے آؤ۔ کچھ باتیں کرنی ہیں۔" اس کی آواز کچھ کمزور لگ رہی تھی۔

بلا تاخیر، عبدالمجید پکوان سے سجی ہوئی تھال اٹھا لایا۔

"تمھاری کتاب کہاں تک پہنچی۔" اس نے البرٹ کے مقابل، کرسی پر براجمان ہوتے پوچھا۔

البرٹ گلاس سے ڈھیر سارا پانی نگلنے لگا۔ اس کی دن بھر کی پیاس بجھ گئی تھی۔

"بس امر تسر میں اپنے تجربات بیان کر کے اس کتاب کو ایک خوبصورت اور پر اثر اختتام دینا ہے۔" وہ کچھ سوچ کر بولا۔

عبد المجید روٹی سے قیمہ لگا لگا کر کھانے میں مگن تھا۔

"خیر مجید۔ تم سے ایک سوال پوچھ سکتا ہوں؟" البرٹ نے اسے بغور کر پوچھا۔

"ایک کیا۔ دس پوچھو۔" وہ نوالہ حلق میں اتارتے، خوش اسلوبی سے بولا۔

بات شروع کرنے سے قبل البرٹ نے گہری سانس اندر کھینچی۔

"کیا تم مجھے جلیاں والا باغ سانحے کے متعلق کچھ بتا سکتے ہو؟ میں نے اخبارات میں پڑھا تو تھا، لیکن ایک دفعہ سب تمھاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔"

یکبارگی عبد المجید کی مسکراہٹ فنا ہوئی۔ آنکھوں میں جو چمک معدوم تھی اس کا دم گھٹ گیا۔ البرٹ تاسف سے اسے دیکھتے گیا۔ البرٹ کو یاد آیا کہ، یہی کیفیت یاسمین پر بھی طاری ہوئی تھی۔

"کیا میں جان سکتا ہوں کہ تم نے کیا پڑھا تھا؟" وہ البرٹ سے نظریں ملائے بغیر بولا۔

البرٹ نے اس کے انداز میں گھلتے کھچاؤ کو بخوبی بھانپ لیا تھا۔

"ہمیں یہی بتایا گیا تھا کہ احتجاجیوں کے پاس اسلحہ تھا۔ اور ان میں سے کچھ ہی مارے گئے تھے، وہ بھی ضرورت کے تحت۔" البرٹ کو جو معلوم تھا، اس نے اگل دیا۔

عبد المجید استہزاء سے مسکرایا۔ اب کہ اس نے گردن اٹھائی تو اس کی آنکھیں کرچیوں کی مانند بکھری ہوئی تھیں۔

"کیا واقعی تم سچ سننے کی سکت رکھتے ہو؟" وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ اب کہ بار وہ البرٹ کی شہد رنگ آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

البرٹ اس کی آنکھوں میں برپا ہوتی توڑ پھوڑ دیکھتے، گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

"میں سچ سننا چاہوں گا۔"

عبدالمجید نے گہری سانس خارج کرتے بات کا آغاز کیا۔

"اسی واقعے میں میں نے اپنے والد صاحب کو کھویا تھا۔" خواب سی کیفیت میں بولتے اس نے بات کا آغاز کیا۔

البرٹ پورے وثوق سے اسے سن رہا تھا۔

"وہ دن مجھے آج بھی ہو بہو یاد ہے، البرٹ۔" اس کی آنکھیں پھیلیں اور ان میں نفرت ابھری۔ نفرت کے پیچھے دبی دبی تکلیف تھی اور بے بسی بھی۔ "ہم سب پر امن احتجاج کر رہے تھے۔ نہ ہمارے پاس کوئی بندوق تھی نہ تلوار۔ صرف ہاتھوں میں بینرز تھے اور ہم، ہم آواز ہو کر احتجاج کر رہے تھے۔ راؤلیٹ ایکٹ کے خلاف، اپنے لیڈرز کے لیے جن کو زندانوں میں پھینکا ہوا ہے۔ ہم اپنے لیے احتجاج کر رہے تھے، اپنے ہندوستانی بہن بھائیوں کے لیے احتجاج کر رہے تھے، اپنے خلیفہ کے لیے احتجاج کر رہے تھے۔ کیونکہ احتجاج ہمارا بنیادی حق ہے۔ ہمارے نظام کو سنبھالنے والے، ہماری آوازوں کو دبانے کی کوشش کیوں کرتے ہیں؟" اس نے ایک وقفہ لیا۔ دل میں دفن جذبات ابل پڑے، تو آنکھیں اشک برسانے لگیں۔ چہرہ سُرخی مائل اور دھواں دھواں ہونے لگا۔

البرٹ کی شہد رنگ آنکھیں مرجھائیں۔ سینے میں تناؤ بڑھنے لگا۔

"پھر جلیاں والا باغ میں موت کا سماں چھا گیا، البرٹ۔ یکدم بھگدڑ مچ گئی۔ تکلیف دہ چیخیں، آہیں گونج اٹھیں۔ وہ لوگ ہمیں گولیوں سے بھون رہے تھے۔ زیادہ تر کو انھوں نے مار دیا اور کچھ اس بھاگ دوڑ میں کچل دیے گئے۔ اس دن جلیاں والا باغ میں خون کی ہولی کھیلی گئی تھی۔ ہمارے ہی خون کی، سُرخ ہولی۔" بات کو اختتام کرتے، اس نے گیلی سانس اندر کھینچی، آنسو صاف کیے، اور نظریں پھر سے جھکا لیں۔

البرٹ کے دل میں ایک ٹیس اٹھی۔ اس کی شہد رنگ آنکھیں رنج میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ سچ واقعتاً المناک تھا۔ اس نے خود سے تسلیم کیا۔

"کتنے لوگ جاں بحق ہوئے؟" اس کی آواز شدتِ تکلیف کے باعث لرکھڑائی۔

"درست تعداد تو آج تک معلوم نہ کی جا سکی، مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ہزاروں مارے گئے۔ ہزاروں آج تک معذور ہیں۔ شاید امرتسر پہلے جیسا نہیں ہو سکتا۔" اس نے مایوس کن سانس خارج کی، مگر گردن نہ اٹھائی۔

البرٹ کا دل کسی باریک پتے کی مانند لڑکھڑانے لگا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ یاسمین کسی تعصب کا شکار نہیں تھی۔ نہ ہی وہ لوگ جو اسے اجنبیت اور بے اعتمادی سے دیکھ رہے تھے، وہ کچھ غلط کر رہے تھے۔

جب ان کو حکومت نے، اس کے اپنے لوگوں نے گھاؤ اتنے گہرے دیے تھے تو وہ کیسے کسی پر بھروسہ کرتے؟ اسے ان تحقیر آمیز نگاہوں، اس عدم تحفظ کی کڑی وضاحت مل گئی تھی۔

دونوں نے خاموشی سے کھانا کھایا۔ ایک رنج کے عالم میں نہ بولا اور دوسرے کو احساسِ جرم نے کچھ کہنے نہ دیا۔

کھانا کھا کر وہ اپنے کمرے میں لوٹ آیا تھا۔ اس نے غسل خانے کا رخ کیا۔ نہا دھو کر، لباس تبدیل کر کے وہ اپنی میز پر بیٹھا۔

کاغذ کے صفحات تیار تھے اور قلم بھی وہیں موجود تھا۔ خالی کاغذ اسے لکھنے کی دعوت دے رہا تھا۔ اور آج وہ لکھنے کے لیے کچھ زیادہ ہی پر جوش تھا، کیونکہ آج اس کے دل و دماغ میں لفظوں کے چشمے پھوٹ رہے تھے۔ وہ بھی ان میں کسی نازک تنکے کی طرح بہہ جانا جاتا تھا۔

قلم اٹھاتے اس نے لکھنا شروع کیا۔ دنیا سے ایک بار پھر منقطع ہو کر وہ لفظوں میں غرق ہو گیا۔ بس پورے جہاں میں وہ تھا، اور اس کے الفاظ۔

"آج جو میری کیفیت ہے وہ میں لفظوں میں بیان نہیں کر پا رہا۔ ایسا نہیں ہے کہ میرے پاس الفاظ نہیں، بلکہ آج الفاظ کی کثرت کچھ یوں ہے کہ میرا قلم الجھن کا شکار ہو گیا ہے۔ بس یوں سمجھ لیا جائے کہ البرٹ ونسٹن آج صحیح معنوں میں دنگ رہ گیا ہے۔

مجھے گمان ہوا تھا کہ، کلکتا کا سفر میرے لیے سب سے یادگار ہے۔ لیکن امرتسر نے مجھے غلط ثابت کیا۔ جو میں اس سفر میں سیکھ رہا ہوں، جان رہا ہوں، وہ مجھے اندر سے دنگ کر رہا ہے، میرے نظریات بدل رہا ہے۔ میری آنکھوں پر سے جھوٹ اور فریب کے پردے ہٹا کر، مجھ پر سچ عیاں کر رہا ہے۔

پہلی چیز جو میں اس سفر میں سیکھی وہ یہ کہ، ہر چیز جیسی دکھائی دے، حقیقت میں ویسی نہیں ہوتی۔ ہاں، یہ فقرہ کافی مرتبہ سن چکا ہوں لیکن اس فقرے کو عملی جامہ پہنتے آج دیکھا ہے۔ دوسری چیز یہ کہ انسان کے معیوب رویوں کے پیچھے خاص وجوہات ہوتی ہیں، ایک کہانی چھپی ہوتی ہے۔ اگر آپ کبھی دیکھیں کہ کوئی انسان آپ سے مختلف رویہ برتتا ہے تو اس کے پیچھے چھپی کہانی دریافت کریں، کیونکہ آگہی دلوں کو بوجھ سے آزاد کر دیتی ہے۔ تیسری بات، جو سچ آپ کو بتایا جاتا ہے، ضروری نہیں وہ سچ کی حیثیت رکھتا ہو۔ کبھی کبھی سچ کو بھی ناپ تول کر کے، اس میں ملاوٹ کر کے، اس میں جھوٹ کا چھڑکاؤ کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ چوتھی بات، جو پہلی سے کافی متشابہت رکھتی ہے وہ یہ کہ، ہر پتھریلا اور سفاک چہرا پتھریلے دل کا مالک نہیں ہوتا، بازدفعہ یہی دل تو دنیا کے پرخلوص دلوں میں سے ہوتے ہیں۔ جن میں محبت کا مادہ سب سے بڑھ کر ہوتا تھا۔

جس لڑکی کو میں کل تک ایک جنگ جو، لڑاکی اور خواہ مخواہ کی غصیلی تصور کر رہا تھا، اس نے مجھے غلط ثابت کیا۔ ہاں میں چمنِ گلاب کی مالکن کی بات کر رہا ہوں۔ کچھ حد تک اس کا کھردرا بد اخلاق رویہ میری سمجھ میں آنے لگا ہے۔ لیکن اب بھی وہ لڑکی کسی راز کی مانند ہے۔ گہرا راز، بہت گہرا، کسی کھائی کی طرح جس کی سطح پر کانٹے ہی کانٹے

ہوں۔ لیکن ان کانٹوں کے باجود میں اس کھائی میں اترنا چاہتا ہوں، جانتا ہوں کہ تکلیف سے لہولہان ہو جاؤں گا، لیکن شاید وہ راز اس قابل ہیں کہ ان کے لیے لہولہان ہوا جائے۔

اب سوال آتا ہے کہ یوں میرے نظریات کیسے بدل گئے۔ تو ہوا یہ کہ۔۔۔"

رات گہری ہوتی گئی۔ لکھتے وقت موہوم مسکراہٹ اس کے لبوں سے جدا نہ ہوئی۔ آج جو بھی اس نے لکھا، دل سے لکھا۔

.....☆☆☆.....

دیکھتے ہی دیکھتے، چار دن گزر گئے۔

گزشتہ دنوں میں ہندوستان بھر لاتعداد احتجاج ہوئے۔ ہندوستانی مسلمان خلافت کے بچاؤ کے لیے سڑکوں پر نکلے ہوئے تھے۔ اور ایسے ہی قوی احتجاج امرتسر میں بھی ہوئے تھے۔ ہاتھوں میں بینرز لیے، مسلمان سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ اور اونچی اونچی آواز میں نعرے لگاتے تھے۔ جیسے کہ: "خلافت زندہ باد"، "انقلاب زندہ بعد"، "سلطنتِ عثمانیہ کی جے!"، "برٹش راج مردہ باد"، "سرحد پار مسلمان کی شان!"۔

ملک کے حالات دن بہ دن بگڑتے جا رہے تھے۔ چونکہ برطانوی حکومت عظیم جنگ کے بعد دیگر معاملات میں مصروف تھی، اس لیے ان احتجاجوں کو روکنے کے لیے، جبر کا استعمال کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہ کرتی تھی۔ برٹش پولیس کئی مرتبہ احتجاجیوں پر لاٹھی چارج کر دیتی اور ان کے لیڈرز، بشمولیت احتجاجیوں کو بڑی تعداد میں گرفتار کیا جا رہا تھا۔ اس سب کے بعد بھی کیا عدمِ خلافت کے زور میں کمی آ رہی تھی؟

ہرگز نہیں۔ مسلمانوں کے احتجاج میں دن بہ دن قوت بڑھتی جا رہی تھی۔

تو یہ تھا ہندوستان کا پسِ منظر۔

چمنِ گلاب کی جانب آتے ہیں۔ آج کے دن آسمان میں بادلوں کی آمد و رفت تھی اس لیے درجہ حرارت میں تھوڑی کمی آئی تھی۔ چمنِ گلاب آنا تو البرٹ ونسٹن کا معمول بن چکا تھا۔ وہ ہر روز کوئی نئی شے آزماتا، اسے کھانے کے بعد برٹش اخبار پڑھتا (اس وقت برٹش حکومت نے ہندوستانی اخبار پر بین لگایا ہوا تھا کیونکہ اکثر اخبار برٹش راج کے خلاف بات کرتے تھے۔) اور جب دن کا اجالا ڈھل جاتا، وہ اپنی آرام گاہ کی خاموشی میں، اپنے تجربات قلم بند کر لیتا۔

یاسمین کو اب البرٹ کی عادت ہونے لگی تھی۔ وہ اسے اپنے آپ میں مگن لگتا تھا۔ اس پورے دورانیے اس نے کچھ بھی قابلِ اعتراض نہیں کیا تھا۔

اس نے مسکرا کر چمنِ گلاب کے سامنے اپنی سائیکل پارک کی۔ ایک نظر اس تختی کو دیکھا۔ آج اس نے یہاں کی چکن بریڈ آزمانی تھی، اس لیے کافی پر جوش تھا۔ دفعتاً اس کی نظروں کا مرکز پولیس کی وہ دو بائیکس بنیں۔ بھنویں سکیڑتے اور چہرے پر تشویش لیے وہ اندر داخل ہوا تو وہ منظر اس کے سامنے عیاں ہوا۔

چمنِ گلاب کے بیچ و بیچ دو برٹش پولیس اہلکار کھڑے تھے۔ دونوں خاکی یونی فارم میں ملبوس تھے۔ ان کی آنکھوں میں دبا دبا سا رعب تھا۔ ایک پولیس اہلکار یاسمین کی کلائیوں پر ہتھکڑیاں لگا رہا تھا۔ اس کی چھاتی پر تختی لگی تھی جس پر اس کا نام درج تھا۔ وہ ولیم تھا۔ اور دوسرا کھڑے ہو کر آس پاس کا جائزہ لے رہا تھا، وہ جیمس تھا۔ یاسمین جب کہ گردن اکڑا کے کھڑی تھی، چہرے پر شانِ استغنا تھی۔ اسے جیسے ولیم کے ہتھکڑی لگانے سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔

البرٹ کی آنکھیں پھیلیں۔ وہ سست روی سے پولیس کی جانب بڑھا۔ جیمس نے اسے دیکھتے ہی مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا کیونکہ وہ بھی ایک برٹش ہی تو تھا۔ البرٹ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرایا۔

"کیا میں ان کی گرفتاری کی وجہ جان سکتا ہوں؟" وہ ادب سے بولا تو جیمس نے سر اوپر نیچے ہلایا اور اپنی جیب سے ایک تہہ شدہ پامفلیٹ نکالا۔

البرٹ نے اسے تھام کر پڑھنا شروع کیا۔ جیسے جیسے وہ پڑھتا، اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتیں۔ اس نے ایک نظر یاسمین کو دیکھا جو کہ بالکل لاتعلق سی کھڑی نہ جانے کس کو دیکھ رہی تھی۔ اس پورے عمل سے جیسے اسے کوئی سروکار ہی نہ تھا۔

اس پامفلیٹ میں برٹش راج کے خلاف بہت سی باتیں درج تھیں۔ خلافت کے حق میں کیا کچھ نہیں لکھا تھا۔ البرٹ نے سب پڑھ کر، ایک پرسوچ سانس خارج کی اور جیمس کو دیکھا۔ آنکھیں جیسے مزید وضاحت کی طلبگار تھیں۔

جیمس نے اس کی شہد رنگ آنکھوں میں وضاحت سننے کی چاہ دیکھی، تو بولنا شروع کیا۔

"مجھے شک ہے کہ ان پامفلیٹ کی اس بیکری سے، خاص کر اس کی مالکن سے وابستگی ہے۔ مجھے یہ باہر ہی ملا تھا۔" جیمس اپنی بڑھی ہوئی شیو کھجاتے بولا۔

البرٹ کاغذ نیچے کر کے، کچھ سوچنے لگا۔ شاید وہ اپنے ذہن میں الفاظ ترتیب دے رہا تھا۔

"میں چمنِ گلاب روز آتا ہوں۔ تاہم مجھے لگتا ہے کہ یہ غلط فہمی کے علاوہ کچھ نہیں۔ یہ پامفلیٹ یقیناً کسی گاہک کا ہو گا۔" اس بات پر جہاں ولیم کے کان کھڑے ہوئے، وہاں جیمس نے بھی تھوڑی پر ہاتھ رکھا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔

"کیا تمہیں یقین ہیں؟"

"جی جی۔ میں البرٹ ونسٹن ہوں۔ نزدیک میں ایک سرائے ہے، جس میں قیام پذیر ہوں اور آج تک مجھے اس بیکری میں کوئی بھی قابلِ اعتراض شے نہ ملی۔"

البرٹ نے بات مکمل کی تو جیمس بری طرح چونک گیا۔ اس کی آنکھیں پھیلیں اور لب خوش گوار حیرت کے باعث جدا ہوئے۔

"البرٹ ونسٹن!" وہ دبے دبے جوش سے بولا اور دوبارہ سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھانے لگا۔

اس پر جوش طرزِ عمل پر البرٹ بوکھلاہٹ کے عالم میں مبتلا ہوا۔ جیمس نے کلام جوڑتے، بات جاری رکھی۔

"میں آپ کے کام کا مداح ہوں۔ آپ کی ڈیٹیکٹو سیریز کی ساتوں کتابیں پڑھ چکا ہوں۔ آٹھویں کا بے صبری سے انتظار ہے۔" وہ بھلا بیٹھا کہ وہ ایک پولیس افسر ہے، اور یہاں کام کے سلسلے میں آیا ہے۔ اندر بسے قاری نے جوش جو مار لیا تھا۔

البرٹ کے چہرے پر شرمیلی مسکراہٹ بکھری اور رُخسار سُرخ ہوئے۔ اپنے قارئین سے یوں ملنے کا تجربہ، بلاشبہ نایاب ہوتا تھا۔

"آپ آٹھویں کیوں نہیں پڑھ رہے؟ ایسا کریں سرائے آجائیں، میں آپ کو فراہم کر دوں گا۔ ڈیٹیکٹو کا کردار آپ کو دنگ چھوڑ دینے والا ہے۔" البرٹ کو تو ویسے بھی اپنے کام کے بارے میں باتیں کرنے کا بہت شوق تھا، اس لیے پورے جوش و خروش کے ساتھ بولا۔

پیچھے سے ولیم نے گلہ کنکھارا تو جیمس کو یاد آیا کہ وہ ایک پولیس افسر ہے۔ اس نے اپنے اندر بسے اس جوشیلے قاری کو قابو کیا اور چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے، سیدھا ہوا۔

"ٹھیک ہے۔ ولیم انہیں آزاد کر دو۔" اس نے حکم جاری کیا تو ولیم اس کی تائید کرتے یاسمین کی ہتھکڑیاں کھولنے لگا۔

تمام ملازماؤں نے آہِ سکون خارج کی جب کہ یاسمین اب بھی بے نیاز تھی۔

"اور مسٹر البرٹ، میں آپ سے آپ کے سرائے میں ملوں گا۔ میرا انتظار کیجئیے گا۔" اس کے کان میں جھکتے وہ گویا ہوا تو البرٹ خوش دلی سے سر اوپر نیچے ہلانے لگا۔

کام سے فارغ ہو کر وہ دونوں چمنِ گلاب سے باہر نکل آئے۔

"اتنی آسانی سے جانے دیا؟" سڑک پر اپنے باس کی پیروی کرتے، ولیم بولا۔

"مجبوری تھی۔" وہ کہہ کر مسکرایا۔

مسکراہٹ مبہم، مگر فتنہ گر تھی۔

یقیناً وہ یاسمین کا پیچھا اتنی آسانی سے چھوڑنے والا نہ تھا۔

.....☆☆☆.....

یاسمین اپنی جگہ پر کھڑی، سرد نگاہوں سے البرٹ کو گھور رہی تھی۔ البرٹ لب بھینچ کر، اس کے چہرے کے زاویوں کو پرکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اندر ہی اندر وہ متجسس تھا کہ یاسمین اس سب کے بعد کیسا طرزِ عمل اختیار کرے گی؟

جب کہ ارد گرد ملازمائیں خوش گپیوں میں مگن ہو گئی تھیں۔

"خوشیاں منانا بند کریں، آپ سب۔ سب کام کی طرف متوجہ ہوں۔ چلیں۔" وہ البرٹ کو گھورتے ہوئے بلند آواز بولی تو ملازماؤں کا شور چھٹنے لگا اور سب کی سب باورچی خانے میں بھاگیں۔

وہ ہاتھوں کو باندھ کر البرٹ کی طرف قدم بڑھانے لگی۔ چال کسی ملکہ سے کم نہ تھی۔ البرٹ اب تک اندازہ لگانے میں کامیاب نہ ہوا تھا کہ وہ کیا کرنے والی تھی۔

وہ دونوں اب روبرو کھڑے تھے۔

وہ اس یکسوئی کے ساتھ دیکھتے، سانسیں تھام کر اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔

”ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس خوش فہمی کا شکار نہ ہوں کہ ہمیں اس سب کی ضرورت تھی۔“ وہ کرخت سے انداز میں چبا چبا کر بولی اور کوئی جواب سنے بغیر بیکری کے اس مخصوص مقام پر چلی گئی جہاں سے گاہک لوازمات خریدتے تھے۔

البرٹ ساکت و جامد اس لڑکی کو دیکھتا گیا۔ اب کہ وہ گاہکوں سے نبٹ رہی تھی۔ اس کی شہد رنگ آنکھوں میں حیرت تھی اور کڑواہٹ بھی۔ اسے اس لڑکی کا بے مروت انداز بری طرح کھل رہا تھا۔

دروازہ کھلا، اور گھنٹی کی آواز گونجی تو البرٹ نے جھٹکا لیا جیسے خواب چشمی کی حالت سے بیدار ہوا ہو۔

وہ نامحسوس انداز میں پیر پٹختے وہاں سے چلا گیا تھا۔

یہ پہلی بار تھا جب وہ چمنِ گلاب سے بنا کچھ خریدے گیا تھا۔

.....☆☆☆.....

تھانے کا کمرہ، مصنوعی روشنیوں میں نہایا ہوا تھا۔ ہر سو ہر دم سکوت کا بسیرا تھا۔ سکوت میں شر کی آمیزش تھی، یقیناً آج اس تھانے میں جمع ہونے والے انسان، بھلی نیت کے نہ تھے۔

سربراہی کرسی پر لوئیس براجمان تھے۔ میز پر ریتیلی گھڑی موجود تھی، جس میں سے ریت کے ذرات ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ایک حصے سے دوسرے حصے منتقل ہو رہے تھے۔

ان کے سامنے جیمس حاضر تھا۔

”سر، شاید مجھے فساد کی جڑ مل گئی ہے۔“ جیمس کی بھوری آنکھیں چمکیں۔ لب دائیں طرف پھیلی۔

لوئیس کے لبوں پر مبہم، مگر پر اعتماد مسکراہٹ ابھری۔ آنکھوں میں ناز تھا۔

”مجھے تم سے ایسی ہی امید تھی۔“ وہ فخر سے بولے۔ ”کون ہے وہ؟ اسے گرفتار کیوں نہیں کیا۔“

”سیدہ یاسمین مجاہد۔“

لوئیس کی بھنویں اٹھیں۔ چہرے پر ستائش پھیلی۔ اس نام نے انہیں چونکا دیا تھا۔

"چمنِ گلاب کی مالکن؟ وہ بیکر؟" دماغ یقین کرنے سے قاصر تھا۔

جیمس کے لبوں پر شاطر مسکراہٹ پھیلی۔ بھوری آنکھیں مکر آلود ہوئیں۔

"سر۔ اس دن، جو پامفلیٹ آپ نے دکھایا تھا مجھے اس میں شیرے کا داغ نظر آیا۔ اس میں بیکری کی مخصوص مہک بھی بسی ہوئی تھی۔ لہٰذا، مجھے شک ہوا کہ یہ کام کسی بیکری کے تحت ہو رہا ہے۔ میں نے تمام بیکریوں کی فہرست تیار کی، اور بار بار میرا دماغ چمنِ گلاب کی طرف جا رہا تھا۔"

لوئیس کو دیکھتے اس نے توقف لیا۔

"آخر کیوں؟"

گہری سانس خارج کرتے اس نے بات جاری رکھی۔

"سیدہ یاسمین مجاہد کی وجہ سے۔ وہ عورت کوئی معمولی عورت نہیں۔ پورا امرتسر اس کی عزت کرتا ہے۔ امرتسر کے مرد، اسے دیکھتے ہی نظریں نیچی کر لیتے ہیں۔ اس کی چال میں شجاعت ہے، اس سے بہتر لیڈر کوئی نہیں ہو سکتا۔"

لوئیس کا ماتھا شکن آلود ہوا۔

"مگر وہ ایک عورت ہے، جیمس۔" وہ بات سمجھنے سے قاصر تھے۔

"اسی لیے تو۔ وہ عورت ہے، اور ہمارا شک اس پر آج تک نہ گیا۔ وہ ایک بہترین ڈھال تھی۔ نہ جانے کتنے اجلاس اور احتجاج منعقد کروائے ہوں، اور ہمیں بھنک بھی نہ پڑی ہو۔"

لوئیس کا ماتھا صاف ہوا۔ چہرے کا تناؤ ڈھیلا ہوا۔ جیمس کی بات میں دم تھا۔

"تو تم مجھے سب کیوں بتا رہے ہو؟ اسے گرفتار کیوں نہیں کیا؟"

(راؤلیٹ ایکٹ کے مطابق، شک کی بنیاد پر، بغیر جاندار ثوابت کے، بغیر کسی وارنٹ کے، ہندوستانیوں کو گرفتار کیا جاسکتا تھا۔)

"میں آج چمنِ گلاب اسی سلسلے میں گیا تھا، اتفاقاً اس کے باہر مجھے ایک پامفلیٹ بھی مل گیا۔ میرے شکوک درست ثابت ہوئے۔ مگر پھر۔" جیمس کے چہرے پر ناگواری ابھری۔ "پھر البرٹ نے اس کے حق میں گواہی دی، اور مجھے اسے چھوڑنا پڑا۔"

"البرٹ ونسٹن؟" مقابل بیٹھے لوئیس کسی سوچ کے تحت بولے۔ "کیا تم البرٹ ونسٹن کی بات کر رہے ہو؟" لوئیس کو یہ بات قابلِ فکر لگی۔

جیمس نے سر اوپر نیچے ہلایا۔

"جی۔ فرینک ونسٹن کا اکلوتا بیٹا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ گرفتاری کے بعد وہ کوئی مداخلت کرے۔ اس کے والد کے پاس اثر و رسوخ ہے، ان کی ایک پکار پر اسے باہر نکالا جاسکتا ہے۔" جیمس کے سفید ماتھے پر فکرمندانہ لکیریں نمودار ہوئیں۔

"مجھے تمھارے اوپر بھروسہ ہے، جیمس۔ تمہیں اس فسادی کو جلد از جلد سلاخوں کے پیچھے پہنچانا ہو گا۔ ان فسادی، دنگا کرنے والوں کا، ہماری عظیم ریاست کی تذلیل کرنے والوں کو آزادی کا کوئی حق نہیں ہے۔ آئی سمجھ؟" آواز میں دھمکی کا عنصر صاف ظاہر تھا۔ "پھر کیا تم نے کوئی تدبیر سوچی ہے؟"

جیمس نے سوال پر سر اثبات میں ہلایا۔

"جی سر۔ میں تدبیر سوچ چکا ہوں۔" لبوں پر مدہم سی عیار مسکراہٹ ابھری۔

لوئیس کی آنکھیں، مزید سننے کی خواہش ظاہر کرنے لگیں۔

"یہ لوگ چاہے جتنے مضبوط اور توانا کیوں نہ بن جائیں۔ ہمیشہ ان کے درمیان میر جعفر بستا ہے۔"

لوئیس کی آنکھوں میں شیطانی چمک در آئی۔ وہ جانتے تھے یہ گفتگو کس رُخ جا رہی تھی۔ وہ پوری محویت کے ساتھ جیمس کو سننے لگے۔

.....☆☆☆.....

("یہ لوگ چاہے جتنے مضبوط اور توانا کیوں نہ بن جائے۔ ہمیشہ ان کے درمیان میر جعفر بستا ہے۔")

کچھ گھنٹے پہلے کے منظر میں لوٹ آتے ہیں۔

جب ولیم سیدہ یاسمین کی کلائیوں پر ہتھکڑیاں لگانے پر مصر تھا۔ تب جیمس، اپنی بھوری آنکھوں سے پوری بیکری کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس کی نگاہ ایک ایک ملازمہ پر ٹھہری۔ ہر ملازمہ کی آنکھ میں پریشانی تھی، خوف تھا۔ سوائے ایک کے۔

اسے اچھوتے سے خوشگوار احساس نے گھیر لیا۔

("ان لوگوں میں مصلحت پرست بستے ہیں، جو مواقعوں کے متلاشی ہوتے ہیں۔ جہاں موقع ملے، وہاں اپنا اصلی چہرہ ظاہر کر جاتے ہیں۔")

امرتسر پر تاریکی کا غلبہ تھا۔ وہ ایک کالونی میں کھڑا، چہل قدمی کر رہا تھا۔ گھروں کے باہر لگے دیوں نے اس گلی کو منور کیا ہوا تھا۔

دفعتاً اسے وہی چہرہ نظر آیا۔ اس چہرے کو دیکھتے ہی، بھوری آنکھیں چوکنّا ہوئیں۔ اپنی ازلی چال چلتے، وہ اس کے پاس جا پہنچا۔

("تاریخ گواہ ہے، جب جب یہ فتح کے قریب پہنچے ہیں، ان کے اپنے ہی لوگوں نے انہیں مار گرایا ہے۔")

اپنی طرف اس برطانوی مرد کو آتے دیکھ کر وہ سہم گئی۔

اس راتِ تاریک میں، گلی ویران تھی۔ خوف و ہراس کا شکار ہونا، ایک فطری عمل تھا۔

"ڈرو مت۔ میں نقصان پہچانے کی نیت سے نہیں آیا۔" اس نے ہاتھ ہوا میں بلند کرتے کہا اور لبوں پر شگفتہ مسکان سجائی۔

وہ خاموش رہی۔

("مجھے بھی شاید، ایک ایسا انسان مل گیا ہے، سر۔")

"میں سیدھا مدعے پر آتا ہوں۔ کیا تم مجھے چمنِ گلاب کا وہ راز بتاؤ گی، جس پر پردہ رکھنے کی تمھاری مالکن کوشش کر رہی ہے؟" اس نے انداز دوٹوک رکھا۔

مقابل کھڑی عورت کی آنکھیں درشت ہوئیں۔

"آپ میرا راستہ نہ روکیں۔ میں آپ کو کچھ بھی بتانے کی قائل نہیں۔" وہ اسی کے انداز میں بولی۔

جیمس کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

"کیا سونے کے زیورات بھی تمھارا منہ نہیں کھولیں گے؟" انداز ذو معنی تھا۔

مقابل کھڑی لڑکی خاموش پڑ گئی۔

یکدم اس نے قدم پیچھے بڑھائے۔ دیوں کی زرد روشنی میں اس کا گندمی چہرا نمایاں ہوا۔

"کتنے دے سکتے ہو؟" روشی کے گندمی چہرے پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

("ان لوگوں کو ہم سے زیادہ، اپنے ہی لوگوں سے خطرہ لاحق ہے۔")

.....☆☆☆.....

کام سے فارغ ہو کر یاسمین چمنِ گلاب سے باہر نکلی ہی تھی کہ اس کی نگاہیں، شہد رنگ آنکھوں والے مرد پر ٹکیں۔ سیاہ آنکھیں ناگواری سے بھڑکیں۔ وہ سر جھٹکتے، اس کے سامنے سے ایسے گزر گئی جیسے اسے دیکھا بھی نہ ہو۔

البرٹ اس کا طرزِ عمل دیکھ کر، لب بھینچتے رہ گیا۔ ضبط کے گھونٹ بھرتے وہ اس کے پیچھے چل پڑا۔

"لیڈی یاسمین! کیا آپ مجھ سے بات کر سکتی ہیں؟" وہ اس کے عقب میں چلتے، اس کی رفتار کا مقابلہ کرتے بولا۔ سانسیں پھولنے لگی تھیں۔

"اگر آپ ہماری رفتار کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ کیونکہ، ہم راہ چلتوں کے لیے رکنے کے عادی نہیں۔"

البرٹ کے برعکس اس کی سانسیں قابو میں تھیں۔

البرٹ نے اکتاہٹ آمیز سانس خارج کی۔ انسان بے مروت ہو، لیکن یاسمین جتنا نہ ہو۔ اس نے دل ہی دل میں تبصرہ کیا۔

"مجھے علم ہے کہ وہ پامفلیٹ کسی گاہک کا نہیں تھا۔ اگر ہوتا، تو مجھے یقین ہے آپ یا ملازمائیں گواہی دیتیں۔"

اس نے سوچا تھا کہ یاسمین پر جب یہ بات منکشف ہو گی تو وہ کوئی ردِ عمل دے گی۔ مگر یاسمین کی بدستور رفتار، اکڑی گردن، اور پر اطمینان چہرہ اس بات کی گواہی دے رہا تھا، کہ وہ سیدہ یاسمین مجاہد کو ذرہ برابر بھی نہیں جانتا۔

"اور میں آپ کے علم سے باخبر ہوں۔" آواز میں دبا دبا تمسخر تھا۔

البرٹ کا خون مزید جلنے لگا۔

"برائے مہربانی اتنے خطرے مول نہ لیں۔ حکومت نے پابندیاں عائد کی ہیں۔ یوں آپ، اور آپ کے عملے کے لیے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔" وہ اس کے ہم قدم چلتے، پھولتی سانسوں کے درمیان اٹک اٹک کر بولا۔

یاسمین نے چند ساعتوں کے لیے گردن موڑ کر اسے دیکھا تھا۔ چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ تھی جس کے توسط، گرما گرم خون البرٹ کے دماغ میں جا لگا۔ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا تھا۔ وہ نہ جانے کیوں اس خود سر لڑکی کی بھلائی چاہ رہا تھا؟ تنبیہ کرنے کے اس عمل پر، اس نے خود کو ملامت کیا۔

"ہم آپ کے مشورے کے لیے مشکور ہیں۔" آواز میں دبی دبی تضحیک تھی۔

البرٹ کا چہرا سُرخ ہوا۔ ضبط اپنی آخری سطح پر تھا۔ کوئی کھڑوس ہو، لیکن یاسمین جتنا کھڑوس نہ ہو۔ ایک بار پھر اس نے دل ہی دل میں تبصرہ کیا۔

"میری بات کھلے دماغ سے سمجھیں، لیڈی یاسمین۔" وہ گہری سانسیں لیتے، آواز میں کوفت اور ناگواری لیے بولا۔ "میں نے آپ کو بھلائی کی خاطر متنبہ کرنا چاہا۔ اس دن جب آپ کو یوں بے سہارا عورتوں کی مدد کرتے دیکھا، تو میں نے یہ جان لیا تھا کہ آپ ایک بھلی انسان ہیں۔ اور بھلے لوگوں کے ساتھ بھلا کرنا چاہیے۔

اگر حکومت نے پابندی نافذ کی ہے تو ہندوستانیوں کو چاہیے کہ وہ ان پابندیوں کا احترام کریں۔ اور مجھے آپ ہندوستانیوں کی یہ منطق اب بھی سمجھ نہیں آتی کہ، جانتے بوجھتے کہ یہ عمل آپ سب کو نقصان دے گا، آپ وہی عمل کر گزرتے ہیں۔ ہاں ٹھیک ہے حکومت نے ناحق ظلم ڈھائے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں آپ پورا شہر اپنے سر پر اٹھا کر اپنی ذات کو نقصان پہنچائیں، وہ بھی ایک مسخ شدہ خلافت کے لیے؟" غصے کے باعث، اس کی زبان پر جو الفاظ امڈ آئے وہ بولتا گیا۔

یاسمین رک گئی۔ اس نے مڑ کر البرٹ کی شہد رنگ آنکھوں کو دیکھا جن میں دبا دبا اشتعال تھا۔ ماتھے پر پسینے کی بوندھیں جھلک رہی تھیں اور سانسیں چڑھی ہوئی تھیں۔

"ہم آپ کے متنبہ کرنے کے اس کریمانہ عمل پر بھی دل سے شکر گزار ہیں۔" اس نے طنز کسا تو البرٹ نے بھنویں سکیڑیں، اور غیر دانستہ گردن جھٹکی۔ یاسمین نے کلام کا سلسلہ جاری رکھا۔

"اور یہ جان کر اچھا لگا کہ، آپ یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ آپ کی حکومت نے ہمارے اوپر بے جا ظلم ڈھائے ہیں۔ لہذا آپ ہمارے اس سوال کا جواب دینا پسند کریں گے کہ، آپ ہندوستان میں کتنے عرصے سے قیام پذیر ہیں؟" سرد انداز میں ادا ہونے والا الفاظ البرٹ کے لیے غیر متوقع تھا۔

وہ پلک جھپکاتے، کچھ دیر اس کا سوال پوچھنے کا مقصد بوجھنے کی کوشش کرنے لگا۔

"ہندوستان آئے مجھے دو سال سے زائد بیت چکے ہیں۔" مگر افسوس، وہ سیدہ یاسمین کو نہیں جانتا تھا، اور یہ اندازہ لگانے میں ناکام ٹھہرا تھا کہ یاسمین یہ گفتگو کس سمت لے جا رہی ہے۔

جواب سن کر، یاسمین تمسخرانہ انداز میں زیر لب ہنس دی۔ البرٹ کی آنکھوں میں ناگواری ابھری۔ وہ لڑکی تمام تر حدود پار کر رہی تھی۔

"آپ کو یہاں آئے صرف دو سال بیتے ہیں۔ تاہم ہماری آپ سے یہی گزارش ہو گی کہ ہم ہندوستانیوں کو مشورے دینے سے گریز کریں۔ ہم ایک عمر اس دیس میں نہ جانے کن کن دشواریوں کا سامنا کرتے کاٹ چکے ہیں۔ آپ نہیں جانتے ہم ہندوستانی اپنی آزادی کے لیے، اپنے حقوق کے لیے کتنے جتن کرتے ہیں۔ لیکن ہم نے آپ سے کسی قسم کی توقعات وابستہ نہیں کی ہیں۔ چاہے جتنے بھی باادب کیوں نہ ہوں، نسل کا اثر تو منتقل آپ میں بھی ہوا ہو گا۔" اس کی آنکھوں میں البرٹ کے لیے حقارت تھی۔

البرٹ کا اب ضبط بری طرح سے جواب دے گیا تھا۔ یہ حملہ ضرورت سے زیادہ ذاتی اور پیچیدہ تھا۔ وہ مروت کی دیواریں روند دینے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

"مجھے آپ لوگوں کی سمجھ نہیں آتی ہے۔" وہ غضب کے عالم میں بولا۔ یاسمین کے اس حملے نے دل میں برچھیاں گھونپی تھیں۔

یاسمین کی آنکھوں کی تپش بھی بڑھ گئی تھی۔ تکرار ایک نیا رنگ لے رہی تھی۔

"ایک طرف آپ سب کہتے ہیں کہ ہم برٹش مغرور قوم ہیں، اور دوسری طرف مجھے آپ اس طرح نیچی نگاہ سے دیکھتی ہیں، نفرت اور حقارت کا نشانہ بناتی ہیں اور تو اور میری نسل تک پر انگلی اٹھاتی ہیں۔ یہاں پر مغرور میں ہوا یا آپ؟ جواب دینا پسند کریں گی، لیڈی یاسمین؟" وہ کڑوے کسیلے لہجے میں بولا تو یاسمین کی آنکھوں سے مزید شعلے پھوٹے۔

”ہم نے آپ کو کچھ مختلف جانا تھا، لیکن آپ اپنی ہر بات سے یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ آپ کو مختلف جان کر ہم نے بہت بڑی کوتاہی کی ہے۔“ اس کی کوئی بات بناطنز کے شروع نہ ہونے والی تھی۔

بہر حال، اس نے البرٹ کو جتاتی گھوری سے نوازتے بات جاری رکھی۔

”جی بالکل، ہماری نظروں میں آپ سب کے لیے حقارت ہے، نفرت ہے۔ لیکن کبھی سوچا ہے کیوں؟ یہ بے عزتی آپ لوگوں کی خود کی کمائی ہوئی ہے، مسٹر البرٹ۔ لیکن آپ رہنے ہی دیں۔ اتنا کھرا سچ سننے کا آپ میں حوصلہ نہیں ہے، اگر سن لیا تو اسے قبول نہیں کر پائیں گے۔ قبول کر لیا تو اسے برداشت نہیں کر پائیں گے۔“ وہ اس کی طرف انگشتِ شہادت اٹھاتے ہموار لہجے میں بولی۔

”واہ واہ۔“ البرٹ نے طنزاً تالیاں پیٹیں۔ ”بس؟ کچھ لوگوں کی زیادتیوں کا ذمہ دار آپ نے پوری قوم کو ٹھہرا دیا؟“ وہ استہزاء کا شکار ہونے لگا تھا۔

پہلے وہ لڑکی، کچھ حد تک برداشت ہو جاتی تھی، مگر اب وہ لڑکی ناقابلِ برداشت بن گئی تھی۔

”ویسے بھی، میں نے تو آپ کا بھلا ہی چاہا تھا۔ میری نیت صاف تھی اس لیے آپ کو خبردار کرنے کی حماقت کر بیٹھا۔ برا لگا ہو تو معافی چاہوں گا۔“ اس کی آواز اداس ہو گئی تھی جیسے یاسمین کے رویے سے اس کا دل پسپا ہو چکا ہو۔

یاسمین کی نظروں میں پنپتی آگ جنون کی حد تک شدت اختیار کر چکی تھی۔

”دیکھیں۔ آپ نے پھر سے میری باتیں ثابت کر دیں۔ آپ سب کو یہی لگتا ہے کہ آپ ہمارے اوپر احسان کر رہے ہیں، ہمارے ساتھ بھلائی اور اچھائی سے پیش آ رہے ہیں۔ آپ سب خود کو ہمارا مسیحا مانتے ہیں۔ کیا ہم غلط ہیں؟“ وہ ہاتھ باندھ کر بولی تو البرٹ نے بے بسی بھرے غصے سے لب بھینچے۔ وہ کچھ الٹا سیدھا کہنے سے خود کو روک رہا تھا۔

”تو کیا یہ سچ نہیں؟ آپ کے دیس میں ہم نے ریلویز بنا کر دیے۔ آپ لوگوں کے دیس ہم ٹیلی فون لے کر آئے۔ آپ لوگوں کو کاروباری فوائد دیے۔ ہم نے ستی پر پابندی لگائی۔ وہ ظالم روایت جس میں بیوہ کو اسی کے شوہر کے ساتھ زندہ جلایا جاتا تھا۔ اس سب کو آپ پل بھر میں بھلا دیں گی؟“ وہ اب اسے نہیں چھوڑنے والا تھا۔ بہت برداشت کر لیا تھا اس نے، بہت سہہ لی تھی اس نے تذلیل۔ اگر وہ ضدی تھی تو وہ بھی اسی کا مقابلہ کرے گا۔

یاسمین قہقہہ بلند کرنے لگی جیسے البرٹ نے کوئی لطیفہ عرض کر دیا ہو۔

اس لڑکی کا ایک ایک عمل، ایک ایک انداز البرٹ کو کھل رہا تھا۔

”ریلویز۔ واہ۔ وہی ریل گاڑیاں ناں، جو آپ نے اس لیے بنوائیں تھیں تاکہ ہم لوگ اپنے دور دراز رشتہ داروں سے مل سکیں؟ لیکن آپ کو میں بتاؤں کہ وہ کس مقصد کے لیے استعمال ہو رہی ہیں؟ ان ریل گاڑیوں میں وہی ہتھیار بھر بھر کے پورے ہندوستان گھومتے ہیں جن سے ہندوستانیوں کا آج سرِ عام قتل ہو رہا ہے!“ وہ دانت پیس کر بولی تو البرٹ کی رنگت بھک سے اڑ گئی۔ چہرے پر پھیلا تناؤ کچھ کم ہوا۔

”ٹیلی فون؟“ وہ استہزائیہ ہنس دی۔ ”آپ لوگوں کا احسان، آپ ہمارے دیس میں ٹیلی فونز لے کر آئے۔ معلوم ہے وہ ٹیلی فونز کون استعمال کرتا ہے؟ آپ کے یہ افسران! ایک دوسرے کو مطلع کرتے ہیں کہ ہمیں اس شہر میں لوگ چاہیے تاکہ ان احتجاجیوں کی لگامیں کھینچ سکیں۔“

وہ سچ کہہ رہی تھی۔ یاسمین نے درست ہی تو کہا تھا۔ وہ سچ سن تو سکتا تھا، لیکن سچ قبول کرنا بہت کٹھن تھا۔ اگر قبول کر لیتا تو اسے برداشت کیسے کرتا؟ اس کی گردن شرم سے جھک گئی۔ دل میں یاسمین کا مقابلہ کرنے کا جو عزم تھا وہ جا چکا تھا۔

"اور یاد دلاؤں آپ لوگوں نے ہمارے کپڑوں کے بیوپار کا کیا حشر کیا؟ یہاں سے سارا را کاٹن لے جاتے ہیں اور اپنے ملک میں کپڑے بنا کر ہمارے ہی ملک میں بیچتے ہیں۔ آپ لوگوں کی وجہ سے کتنے بھلے بھلے خاندان سڑکوں پر آ گئے تھے۔

اور کیا کیا گنواؤں میں؟

اور عظیم جنگ کا عظیم دھوکہ، دغا یاد کرواؤں؟ کیسے ہم مسلمانوں کو دھوکہ دیا گیا؟ کیسے ہمیں یقین دلایا گیا کہ سلطنتِ عثمانیہ کو نہیں توڑا جائے گا اور آج وہ لوگ پورے شوق و ذوق سے اپنی زباں سے پھر چکے ہیں۔ اور آپ کو یاد دلاؤں ان جانوں کے بارے میں؟ دنیا بھر میں آپ کی حکومت نے لاتعداد مسلمان سیپائیز کو مارا ہے۔ اور کون سی بھلائیاں جاننا چاہیں گے مسٹر البرٹ؟" اس کی آواز تکلیف کے مارے کپکپانے لگی۔ اس نے سانس لینے کو توقف لیا اور البرٹ کو دیکھا جو کہ اب اس سے نظریں نہیں ملا پا رہا تھا۔

بلاشبہ، اس لڑکی نے اسے لاجواب کر دیا تھا۔ شہد رنگ آنکھیں اپنی ہار تسلیم کر چکی تھیں۔

"ہاں ہمیں اس حکومت سے نفرت ہے۔ اور ہمیں اس نفرت پر فخر محسوس ہوتا ہے۔ مجھے آپ کچھ مختلف لگے تھے لیکن آپ نے ثابت کر دیا کہ سارے برٹش ایک جیسے ہوتے ہیں۔

اور جہاں بات ہے ان پامفلیٹس کی، ان پر ائیویٹ گیدرنگز کی تو وہ بھی ہم ترشان کریں گے! ہم کریں گے احتجاج، ہم نعرہِ حق بلند کریں گے۔ ہم اپنی آزادی کے لیے ہر حد پار کر سکتے ہیں مسٹر البرٹ، اور کوئی ہمیں نہیں روک سکتا۔ اور ہم پتہ ہے یہ سب کیوں کر رہے ہیں؟"

البرٹ نے اب کی بار نظر اٹھا کر یاسمین کو دیکھا جس کی آنکھوں میں تکلیف امڈ آئی۔ چہرے پر تکان تھی۔ البرٹ نے ترنت ہی نظریں چرا لیں۔ وہ ان آنکھوں میں زیادہ دیر دیکھنے کی ہمت نہ رکھتا تھا۔

"تاکہ آئندہ نسل وہ نہ دیکھے جو تیرہ اپریل کو ہم سب نے جلیاں والا باغ میں دیکھا تھا!" سیاہ آنکھوں کے گوشے نم ہوئے۔ لیکن اس نے آنسوؤں کو بہنے سے روک لیا۔

البرٹ ونسٹن کے رونگٹے کھڑے ہوئے۔ یاسمین کی آواز میں تڑپ اور تکلیف کے ولولے نے اسے اندر تک دہلا دیا تھا۔

"اور جسے آپ مسخ شدہ خلافت کہتے ہیں، وہ ہم برِ صغیر کی مسلمانوں کی شان ہے! دنیا بھر میں مسلمان نو آبادی کا شکار ہیں، دنیا بھر میں ہمیں مارا جا رہا ہے۔ ہمارا آسرا پتہ ہے کون ہے؟ وہی مسخ شدہ خلافت۔ ہمارے پُرکھوں نے خلیفہ سے ہمیشہ وفا کی ہے۔ جب روسی جنگ ہوئی تھی تب برِ صغیر کے مسلمانوں نے انہیں بھاری تعداد میں امداد فراہم کی تھی۔ ہمارے مرد جنگ لڑنے گئے تھے۔ ہم نے صدیوں سے وفا نبھائی ہے، اور آج جب خلافت اپنے سب سے کمزور لمحات میں ہے، ہم اسے کیسے چھوڑ جائیں؟ وہ پابندیاں عائد کرتے ہیں تو کرتے رہیں۔ ہم پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ خلافتِ عثمانیہ برِ صغیر کے مسلمانوں کی وہ دکھتی رگ ہے، جسے چھیڑ کر ان لوگوں نے بہت بڑی خطا کر ڈالی ہے۔ لیکن نہیں، آپ کبھی کچھ نہیں سمجھیں گے۔"

وہ کہہ کر دو قدم پیچھے ہوئی اور اونچی سانسیں لینے لگی جیسے مزید کچھ کہنے کی اس میں سکت باقی نہ رہی ہو۔

البرٹ بدستور گردن جھکائے کھڑا رہا۔ آج وہ خود کی نظروں میں بری طرح گر گیا تھا۔ یاسمین سانس بحال کر کے وہاں سے چلی گئی اور کسی گلی میں گم ہو گئی۔

اس نے سر جھٹک کر واپسی کی راہ پر چلنا شروع کیا۔

اسے اپنے آپ پر شرم محسوس ہو رہی تھی۔ کیسی شان سے اس نے کہا تھا کہ وہ لوگ حکومت کے احکامات کا احترام کریں، جب کہ اسی حکومت نے ان کا کوئی احترام نہ کیا۔ ان کے جذبات کے ساتھ موت کا بھیانک کھیل کھیلا۔ پھر وہ ایسی باتیں کیسے کہہ سکتا تھا؟ اسے اپنا ہر ایک لفظ یاد تھا اور ہر ایک لفظ پر وہ تہِ دل سے نادم تھا۔

دفعتاً سماعت میں ایک دل خراش چیخ گونجی تو اس کے حواس چوکنّا ہوئے۔ دماغ میں خون کی روش بڑھ گئی۔ وہ اس چیخ کا تعاقب کرتے ایک گلی میں پہنچا اور اس منظر کو دیکھ کر اس کا دل برق رفتاری سے دھڑکنے لگا تھا۔

یاسمین کو نقاب پوش مرد نے دیوار سے لگایا ہوا تھا اور اس کا چہرا اپنے ہاتھ میں دبوچا ہوا تھا۔ وہ اس کی گرفت سے آزادی حاصل کرنے کی ناکام کوششیں کر رہی تھی۔ البرٹ کی سانسیں تیز ہوئیں۔ بغیر کچھ سوچے، وہ اس نقاب پوش آدمی کی جانب بڑھا اور اس کے جبڑے پر زوردار مکا مارا۔ اس کی خدوخال سے اتنا تو ظاہر تھا کہ وہ کوئی ہندوستانی تھا۔

یاسمین اس کی گرفت سے آزاد ہوئی تو گھٹنوں کے بل زمین پر جا گری۔ اس کا سر چکرا رہا تھا اور حواس شل تھے۔

البرٹ اسے ایک اور مکا مارنے ہی لگا تھا کہ نقاب پوش مرد نے اسے ہاتھ سے جکڑا اور اس کے چہرے پر جوابی مکا دے مارا۔ مکا اتنا زوردار تھا کہ اس کے منہ سے خون بہنے لگا۔ وہ آدمی البرٹ سے کئی گنا طاقتور ثابت ہو رہا تھا۔ اس نے البرٹ کو بالوں سے پکڑا اور اس کا سر دیوار سے دے مارا۔ البرٹ کے سر سے خون بہنے لگا۔ پھر اس مرد نے اسے ایک زوردار مکا مارا اور پل بھر البرٹ زمین میں ڈھیر ہو گیا۔ اب وہ البرٹ کے پورے جسم پر لاتیں برسا رہا تھا۔ البرٹ تکلیف سے کراہتا، چلاتا، لیکن اس آدمی کو اس پر کوئی رحم نہ آیا۔ وہ تو جیسے آج اس کی جان لے کر ہی دم لینے والا تھا۔

پل بھر یاسمین کو ہوش آیا۔ اسے آس پاس شور کی آوازیں آنے لگیں۔ اپنے سامنے وہ منظر دیکھ کر اس کا دل خوف سے کپکپایا۔ مگر اسے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ اگر وہ جلد کچھ نہ کرتی تو شاید اپنی آنکھوں کے سامنے خون ہوتا دیکھ لیتی۔ یکدم اس کی نظر، برابر میں پڑی لکڑی کے ڈنڈے پر پڑی۔ اس نے بلا تاخیر اسے اٹھایا۔ کھڑے ہو کر، پوری قوت سے اس آدمی کے سر پر دے مارا۔ تکلیف دہ سسک جاری کرتے وہ آدمی زمین میں گرتا چلا گیا۔

یاسمین کی نظر، زخمی البرٹ پر پڑی جس کے کپڑے خون میں بھیگ چکے تھے۔ اس کے حلق سے چیخ ادا ہوئی۔ اس نے غیر دانستہ طور ہاتھ لبوں پر رکھ دیا۔ اس منظر نے اسے بے سدھ چھوڑ دیا تھا۔

اسی وقت گلی کے کونے سے ایک عمر رسیدا جوڑا نمودار ہوا۔ دونوں میاں بیوی تھے اور برابر والی گلی سے، شور کا تعاقب کرتے یہاں آ گئے تھے۔

اس سفید مرد کو زخمی دیکھ کر دونوں کچھ حیران ہوئے اور پھر انھوں نے دہشت میں مبتلا یاسمین کو دیکھا جو کہ کپکپا رہی تھی۔ دونوں کو طرح طرح کے خدشات ستانے لگے۔

"یاسمین۔ سب خیریت تو ہے؟" عمر رسیدہ مرد اپنے سفید بالوں پر ہاتھ پھیرتے بولے۔

"نہیں تنویر چچا۔ ایک بد معاش ہمارے پیچھے لگ گیا تھا اور پھر یہ ہمیں بچانے آئے۔ اسی سلسلے میں ان کا یہ حال ہو گیا۔" اس نے گہری گہری سانسیں لیتے انہیں سب بتایا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے حواسوں کو قابو نہیں کر پا رہی تھی۔

"میں اس بد معاش کو تھانے چھوڑ کر آتا ہوں اور یاسمین، تم قدسیہ کے ساتھ اسے گھر لے کر جاؤ اور اس کی مرہم پٹی کرو۔" انھوں نے یاسمین کی حالت دیکھی تو خود ہی ایک حل نکال لیا۔

یاسمین بد حالی کے عالم میں گردن اوپر نیچے ہلانے لگی۔ تنویر صاحب اس نقاب پوش مرد کو کندھوں سے اٹھا رہے تھے جب کہ دونوں خواتین زخمی البرٹ کی طرف بڑھیں جو کہ درد کی شدت سے اب تک کراہ رہا تھا۔

یاسمین کا دل یکدم بھاری ہو گیا تھا۔ البرٹ کی حالت کا ذمہ دار وہ خود کو ٹھہرا رہی تھی۔

.....☆☆☆.....

یہ گھر کا اضافی کمرہ تھا۔ جو کہ چھوٹا مگر پر سکون تھا۔ کمرے میں لالٹین کی زرد روشنی معدوم تھی۔ تنویر صاحب تھانے سے لوٹ آئے تھے اور قدسیہ اور یاسمین کے سرہانے موجود تھے۔

البرٹ بستر پر دراز سا لیٹا تھا اور نیند کی وادیوں میں گم تھا۔ اس کے پورے جسم پر پٹیاں لگی ہوئی تھیں۔

"اللہ کا شکر ہے کہ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا اور وقت پر سب ٹھیک ہو گیا۔" تنویر صاحب مدبر انداز میں بولے۔

یاسمین اب بھی زخمی البرٹ کو دیکھ رہی تھی اور نہ جانے کن سوچوں میں گم تھی۔ البتہ، اپنے حواسوں پر وہ قابو پا چکی تھی۔

"یاسمین بیٹی، تم واقف ہو یہ گلی ویران ہے تو رات کے پہر اکیلے نہ گزرا کرو۔ کسی ملازمہ کے ساتھ آیا کرو یا مغرب سے قبل آجایا کرو۔" قدسیہ کا لہجہ متفکر تھا۔

یاسمین نے سوچوں میں غرق ہی سر اثبات میں ہلایا۔

"جی۔ ہم ضرور کوئی حل نکال لیں گے۔ آئندہ کے لیے محتاط رہنا ضروری ہے۔" آواز بھاری اور کھوئی کھوئی معلوم ہوئی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ بس اللہ کا شکر سب ٹھیک ہو گیا۔ اب آگے بڑھتے ہیں۔ قدسیہ آپ یاسمین کے ساتھ قیام کر لیں۔ کل صبح آجایئے۔ یاسمین اپنا دھیان رکھیں اور کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو ہم حاضر ہیں۔" وہ نظریں نیچی کر کے لہجے میں احترام لیے بولے۔

قدسیہ نے بھی ان کے حکم کی تکمیل کرتے سر اثبات میں ہلایا۔ جب کہ یاسمین زخمی اور کمزور البرٹ کو دیکھتی گئی۔

اس کا دل بوجھ زدہ ہو رہا تھا۔ کانٹے اس کی روح میں پیوست ہو رہے تھے۔ وہ جب تک البرٹ سے اپنے تلخ رویے کی معافی طلب نہ کر لیتی اسے سکونِ قلب عطاء نہ ہونا تھا۔

.....☆☆☆.....

کھڑکی کی حدت پار کر کے دھوپ اس کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ بھورا فرنیچر اب کہ سنہرا دکھائی دے رہا تھا۔ کرنوں کی تپش نے اسے نیند سے بیدار کیا تو اس نے پلکوں پر زور دیتے اپنی آنکھیں کھولیں۔ اس کا سر بھاری ہو رہا تھا اور اسے کچھ بھی یاد نہیں آ رہا تھا۔ انجانی سی جگہ دیکھ کر وہ ہڑبڑا کر حرکت کرنے لگا کہ جسم میں تکلیف کی زور دار لہر ابھری اور وہ سسک جاری کرتے پھر سے لیٹ گیا۔ اس نے خود کو ایک نظر دیکھا۔ جسم پر جگہ جگہ پٹیاں بندی ہوئی تھیں۔

یکبارگی اس کی یادوں نے ذہن کے خانوں میں دستک دی تو وہ ساکت رہ گیا۔ اسے پریشانی نے گھیر لیا اور دل بے قراری کے مارے مچلنے لگا۔ اس نے تکلیف کے باوجود خود کو کھڑا کیا۔ بستر کے کنارے اس کا کوٹ رکھا تھا اور خون آلود شرٹ بھی۔

اس نے کوٹ پہننے کا عمل شروع کیا۔ پیٹھ کے زخموں سے کوٹ کی رگڑ ہوئی تو اس نے تکلیف دہ سسک جاری کی۔ مگر اس نے ہر تکلیف کو نظر انداز کیا، کیونکہ اسے فوری طور پر یہاں سے نکلنا تھا۔ صرف یہاں سے ہی نہیں، وہ اب ہندوستان سے ہی چلے جانا چاہتا تھا۔ کل وہ سچ جاننے کے بعد وہ مزید یہاں نہیں رہ سکتا تھا۔

وہ گھر کی داخلی راہداری پر لنگڑاتے پہنچا۔ جسم جواب دے رہا تھا لیکن اس نے ضبط بحال رکھا۔ وہ جلد از جلد بگھی پر سوار ہو کر سرائے پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اسے بلا تاخیر واپسی کے انتظامات جو کرنے تھے۔

اسی وقت پیچھے سے ایک سرد اور رعب دار آواز گونجی تو وہ چونک گیا۔

"آپ جا رہے ہیں؟" یاسمین کو اس کی پشت نظر آ رہی تھی۔ اس کے گندمی چہرے پر تکان تھی۔

البرٹ یکدم سکتے میں آ گیا۔ آج اس کی آواز میں کچھ ایسا تھا جس نے اسے حیران کر دیا۔ مدھم سی نرمی گھلی ہوئی تھی اس کی آواز میں۔ اس نے الجھ کر بھنویں سکیڑیں۔

"جی۔" آواز بلا تاثر تھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ شاید وہ اسے دیکھنے کی ہمت کھو بیٹھا تھا۔

یاسمین کی نگاہیں ترحم ہوئیں۔

"کیا آپ ہمیں معاف کر سکتے ہیں؟"

وہ جملہ سن کر البرٹ پورا کا پورا مڑ گیا اور یاسمین کو گھورنے لگا۔ اسے یقین نہ آیا کہ وہ یاسمین ہی تھی۔ حیرت کے جھٹکوں کا مقابلہ کرتے اس نے لب کھولے۔

"معافی تو مجھے مانگنی چاہیے۔ کل رات میں نے جو بھی کہا، مجھے نہیں کہنا چاہیے تھا۔" وہ بمشکل اپنی حیرت چھپا پایا۔ یاسمین کے متغیر ہوتے انداز نے اسے دنگ چھوڑ دیا تھا۔

"نہیں البرٹ۔ خطا ہماری ہے۔ ہمیں کسی نے حق نہیں دیا کہ آپ کی اس قدر تذلیل کریں جب کہ آپ نے آج تک کچھ قابلِ اعتراض نہیں کیا۔ ہم اپنے اعمال کی کوئی وضاحت نہیں دیں گے کیونکہ جو غلط ہے وہ غلط ہے۔" گردن اکڑی ہوئی تھی، مگر چہرے سے وہ نادم تھی۔

البرٹ نے پلکیں جھپکا کر استعجاب سے کچھ دیر یاسمین کو دیکھا۔ آج پہلی مرتبہ اسے یاسمین کے گندمی چہرے کو دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ اس چہرے میں سب سے نمایاں شے وہ بادامی سی سیاہ آنکھیں تھیں۔

"تو بتائیں؟ کیا آپ ہمیں معاف کریں گے؟" اب کہ وہ سیاہ آنکھیں البرٹ کے دل کو موم کی طرح پگھلنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ وہ محویت سے اسے دیکھتا گیا، پھر سر جھٹک دیا۔

"اچھا۔ ایک شرط پر۔" وہ مسکرایا تو یاسمین کے دل سے وزن سرکنے لگا۔

"جی جی۔ بتائیں۔"

"آپ مجھے رام باغ گارڈن لے کر جائیں گی۔ اور برائے مہربانی انکار سے گریز کریں۔ مجھے اکیلے گھومتے کوفت محسوس ہوتی ہے اور مجھے وہاں جانا بھی ہے۔"

اس کی شہد رنگ آنکھوں میں منت دیکھ کر یاسمین انکار نہ کر سکی۔ اس نے ہاری ہوئی سانس خارج کی۔

"اچھا۔ چلیں، کب جائیں گے۔" وہ اندر سے مطمئن ہونے لگی تھی۔ اپنے دل کے سکون کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔

"بس جیسے ہی زخم تھوڑے بہتر ہو جائیں گے میں بگھی لے کر چمنِ گلاب پہنچ جاؤں گا۔" وہ تکلیف کے باوجود آخر میں مختصر مسکرایا۔ یاسمین کو احساس ہوا کہ وہ تکلیف چھپانے میں کافی مہارت رکھتا تھا۔

"اچھا۔ ٹھیک ہے۔ اور ہاں، کچھ دن آرام فرمائیں، کام کاج کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" ایک دفعہ پھر سے یاسمین کے چہرے پر سرد مہری اور سفاکی لوٹ آئی تھی۔ آنکھوں کی ٹھنڈک اور دبا دبا رعب واپس اپنی جگہ پر آچکا تھا۔ البرٹ یہ تبدیلی دیکھ کر بے اختیار مسکرایا۔

"اب یہ ظلم نہ کریں۔" آواز میں مصنوعی خفگی تھی۔ "میں چلوں گا پھروں گا نہیں تو چمنِ گلاب کیسے آؤں گا؟ خدارا میں کل وہاں سے کچھ نہ لینے پر ویسے ہی خود کو ملامت کر رہا ہوں۔"

یاسمین کی آنکھوں میں پر سوچ تاثر ابھرا۔

"آپ فکر نہ کریں۔ ہم سرائے میں روز کچھ نہ کچھ بجھوا دیں گے۔ اپنی صحتیابی تک آرام فرمائیں۔"

اس کی پیش کش پر البرٹ خوشی سے چہک اٹھا۔

"اجازت چاہوں گا۔" سر کو خم کر وہ مڑ گیا۔ یاسمین اسے جاتے دیکھ رہی تھی۔ دروازے پر پہنچ کر وہ تھم گیا اور مڑ کر یاسمین کو دیکھنے لگا۔

"آپ سے ایک بات کہہ سکتا ہوں؟" برفیلے چہرے والی گندمی لڑکی کو دیکھتے، وہ شریر لہجے میں بولا۔

یاسمین نے سرد مہری سے گردن ہلا کر اسے اجازت دی۔ پلک جھپکاتے وہ اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگی۔

"آپ کے کرخت انداز ہی آپ پر جچتے ہیں۔" بس اتنا سا کہہ کر وہ دروازہ پار کر گیا۔

یاسمین کے لب کھلے کے کھلے رہ گئے۔

یک دم وہ ہنس پڑی۔ اس بار ہنسی و مسکراہٹ پھیکی اور بے مقصد نہ تھی، بلکہ اس میں خوشی کی رمق تھی۔ بہت عرصے بعد وہ اس طرح ہنس رہی تھی اور یوں ہنس دینے کے بعد دل کس طرح کی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے، وہ تو جیسے بھول ہی چکی تھی۔

.....☆☆☆.....

اس دن شہر امرتسر کے آسمان پر بادلوں نے چادر اوڑھی ہوئی تھی۔ البتہ، بادل برسے نہیں۔ بس ٹھہر کر امرتسر کے باشندوں کی زندگیوں کے حصہ بنے ہوئے تھے۔

چمنِ گلاب کے باورچی خانے میں یاسمین بلند آواز میں ملازماؤں کو ہدایات دے رہی تھی۔ ٹھیک اسی وقت باورچی خانے میں روشی داخل ہوئی۔

"یاسمین صاحبہ۔"

اس کی پکار پر یاسمین مڑی۔

ماتھے پر شکنیں نمودار ہوئیں۔

"فرمایئے۔" اپنے ازلی انداز میں گویا ہوئی۔

"باہر، بگھی آپ کا انتظار کر رہی ہے۔ البرٹ صاحب اس میں سوار ہیں۔"

یاسمین کے ماتھے کی شکنیں فنا ہوئیں۔ آنکھوں میں مسرت ابھری۔

"ٹھیک ہے۔ ہم آرہے ہیں۔ ہماری واپسی تک، بیکری سنبھالیے گا۔" اس نے نرم آواز میں اسے ہدایت دی۔ روشی نے ادب کے ساتھ سر کو خم دیا۔

جانے سے قبل، یاسمین کی نظر روشی کی بالیوں پر پڑیں جو اسے سونے کی لگی تھیں۔ اس نے بھنویں سکیڑیں۔ دماغ میں ان کے متعلق سوالات ابھرے تھے، مگر سب نظر انداز کر کے وہ باہر چلی گئی۔

البرٹ بگھی کے اندر بیٹھا ہوا تھا۔ آج کے دن کی مناسبت سے وہ کافی تیار تھا۔ سفید شرٹ پر اس نے نیلا اوورل آل پہنا ہوا تھا اور نیلا کوٹ بھی۔ سر پر نیلی ٹوپی بھی جمائی ہوئی تھی۔ بہر حال مونچیں وہ کاٹ چکا تھا۔

کچھ لمحے بیت گئے تو یاسمین بگھی میں سوار ہوئی۔ اسے دیکھ کر البرٹ کی آنکھیں کھل اٹھیں۔ اس نے سرمئی کرتا شلوار زیب تن کیا ہوا تھا اور سر پر سرمئی ڈوپٹہ جمایا ہوا تھا۔

"مجھے لگا کہ آپ ارادے بدل چکی ہیں۔" وہ اسے دیکھتے خوشی سے بولا۔

یاسمین کے چہرے پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اپنے ارد گرد خول کو چڑھا کر وہ ایک بار پھر سے سرد و سفاک یاسمین بن گئی تھی۔

"ہم اپنے وعدوں سے پھرا نہیں کرتے، البرٹ۔" وہ اس کی جانب گردن موڑتے شان سے بولی۔

البرٹ مسکرا دیا۔ اسے یاسمین کے اس پر تحکم، رعب دار انداز کی عادت ہو چکی تھی۔ اور اسے وہ ان ہی انداز کے ساتھ اچھی لگتی تھی۔

بگھی بان نے لگام کھینچی تو گھوڑا ہنہنایا اور بگھی دوڑنے لگی۔ البرٹ اور یاسمین، دونوں کے موڈ ہی خوشگوار تھے۔

لیکن کوئی تھا جو اس بگھی کو دیکھ کر سراسر ناخوش تھا۔ اس نے وہی یونی فارم پہن رکھا تھا، جو وہاں کے پولیس افسر پہنا کرتے تھے۔ چھاتی پر اس کے نام کا ٹیگ تھا جس پر انگریزی حرف میں "جیمس اینڈرسن" لکھا ہوا تھا۔ یک دم اس کی آنکھیں سوچ میں چھوٹی ہوئیں، جیسے کسی خیال نے اس کے دماغ میں جنم لیا ہو۔

اور تم بھی اندازہ لگا سکتے ہو یہ خیال شیطانی تھا۔ دماغ منصوبوں کو ترتیب دینے میں مگن تھا۔

وہ کیسے اپنے ہی ملک کے باشندے کو ایک ہندوستانی عورت کے ہتھے چڑھتے دیکھ سکتا تھا؟ وہ بھی ایک مسلمان۔ کبھی نہیں۔ اسے یہ قربت بری طرح کھل رہی تھی۔

سر جھٹک کر اس نے اپنا دوراجاری رکھا۔ البتہ، یاسمین کی زندگی دشوار بنانے کا ارادہ، پختگی اختیار کر چکا تھا۔

.....☆☆☆.....

بھوری بگھی امرتسر کی ایک گلی سے دوسری، اور دوسری سے تیسری کا سفر طے کرتی۔ دیکھا جائے تو امرتسر ایک خوبصورت شہر ہے۔ یہاں کی عمارتیں تو کسی شاہکار سے کم نہیں۔ ان پر تعمیراتی کام انتہا کا تفصیلی اور دلکش ہے۔ ہر کالونی میں مختلف لباس میں لوگ نظر آئیں گے۔ کہیں پر عورتیں ساڑھیوں میں ملبوس، تو کہیں پر عبایا میں۔ یہی ماجرہ مردوں کا بھی تھا۔ کہیں وہ اچکن میں ملبوس ہوں گے تو کہیں کوٹ پینٹ یا دھوتی میں بھی۔

"کیا آپ ماہراجہ رنجیت سنگھ میوزم جائیں گے؟" یاسمین نے سیدھ میں دیکھتے سوال پوچھا۔

"نہیں نہیں۔ مجھے تاریخ میں کوئی دلچسپی نہیں۔" اس بات پر یاسمین نے الجھ کر بھنویں سکیڑیں، البتہ آنکھوں کی سرد مہری برقرار رہی۔

"ہم تو یہیں سمجھے تھے کہ آپ ماہراجہ رنجیت سنگھ میوزیم کا دورہ کریں گے۔ کیونکہ وہ سیاحوں میں کافی شہرت کا حامل ہے۔ پھر کسی چیز میں دلچسپی ہے آپ کو؟" لاتعلق انداز۔

البرٹ کی آنکھوں میں روشنیاں انعکاس ہونے لگیں۔

"کھانے میں!" وہ کھکھلا کر بولا تو یاسمین نے مڑ کر اسے دیکھا۔ "وہاں امرتسری کلچا ملتا ہے۔ مجھے وہ کھانا ہے اور اپنی کتاب میں اس کو کھانے کا تجربہ تحریر کرنا ہے۔"

یاسمین کو اس کی ترغیب کچھ معیوب معلوم ہوئی، جس باعث اس نے آنکھیں چھوٹی کیں۔

"یعنی آپ پکوانوں پر کتاب لکھ رہے ہیں؟ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ نے چمنِ گلاب کی بھی تمام اشیاء کو اپنی کتاب میں شمار کیا ہو گا؟" اس کی آواز میں استفہام تھا۔

"جی جی۔ بالکل کیا ہے۔" وہ مڑ کر یاسمین کو دیکھنے لگا۔ "لیکن میری کتاب صرف کھانے پینے کے بارے میں نہیں، غالباً کھانا پینا اور ہندوستان کی وسیع ثقافت اس کا حصہ ضرور ہے لیکن یہ کتاب میرے تجربات پر مبنی ہے۔ اب اتفاق سے میرے تجربات میں کھانا پینا غالب ہے تو یہ کتاب ایک طرح سے ہندوستان کے وسیع کیوزین پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔"

اب یاسمین کو اس کی کتاب کی تھوڑی بہت سمجھ آگئی تو اس کی آنکھیں عامیانہ ہوئیں۔ اس نے گردن موڑی اور چکور کھڑکی سے باہر کے مناظر تکنے لگی۔

دفعتاً گھوڑے ہنہنائے اور بگھی نے جھٹکا کھایا۔

بگھی تھم گئی تھی اور ان دونوں کو بھی آگہی مل گئی تھی کہ، ان کی منزل آپہنچی تھی۔

.....☆☆☆.....

چودہ فٹ اونچا گیٹ ان دونوں کا استقبال کر رہا تھا۔ گیٹ کے دونوں اطراف قد آور منار بھی تھے۔

رام باغ کے چاروں اطراف چودہ فٹ لمبی دیواریں قائم ہیں۔ باغ کو آسمان کی بلندیوں سے دیکھیں تو نہایت خوبصورت نظر آئے گا۔ پتھروں کے بنے متناسب راستے دکھائی دیں گے۔ باغ کے وسط میں ہی ایک محل بھی نظر آئے گا۔ اور اسی محل کے دائیں بائیں طرف راستے بنے ہوئے تھے جو کہ دو چھوٹے چھوٹے محلوں تک جاتے تھے۔

رام باغ گارڈن میں داخل ہوتے ہی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا دونوں سے ٹکرایا۔ وہ دونوں پتھریلی روش پر چل رہے تھے۔ دائیں اور بائیں جانب اونچے تن آور، ہرے بھرے درخت تھے اور چاروں طرف ہریالی ہی ہریالی تھی۔ چرند پرند کی چہچہاہٹ کانوں میں رس گھول رہی تھی۔ فضا کی تازگی نے اس منظر کو مزید خوبصورتی بخشی۔

"آہ! قدرت۔ مجھے قدرت بہت پسند ہے۔" البرٹ چہکا جب کہ یاسمین میکانکی سے انداز میں چلتی گئی۔

باغ میں رش کافی زور و شور سے تھا اور عموماً سکھ ہی نظر آرہے تھے۔ البتہ گارڈن کا رقبہ اس قدر وسیع تھا کہ اس رش کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

"آپ یہاں کتنی مرتبہ آچکی ہیں؟" اس نے گفتگو چھیڑی۔

یاسمین کی سیاہ آنکھیں، کسی یاد میں کھوئی ہوئی معلوم ہوئیں۔

"ہاں۔ کسی زمانے میں ہم بھی یہاں آیا کرتے تھے۔ اپنے والد کے ساتھ۔" پھیکی مسکراہٹ اس کے چہرے پر ابھری۔

"اب آپ کا خاندان کہاں ہے، یاسمین؟"

یاسمین کے چہرے پر استہزا مسکراہٹ ابھری۔

"قبرستان۔" یک لفظی جواب نے البرٹ کے رونگٹے کھڑے کر دیے۔

دل میں بسی خوشگواری کی جگہ افسردگی نے لے لی۔ وہ خوشگوار منظر، ٹھنڈی ہوائیں اور چرند پرند کی چہچہاہٹ بھی اس افسردگی کو جگہ سے نہ ہلا سکیں۔

کچھ لمحات خاموشی کی نذر ہوئے۔ البرٹ بھی کچھ نہ بولا، اور یاسمین تو خاموش ہی رہتی تھی۔

"ہم جانتے ہیں کہ ہم ایک خشک ساتھی ہیں۔ یقیناً آپ بے زار ہو رہے ہوں گے۔ یہ تو آپ کی ضد کی بدولت ہمیں آنا پڑا، ورنہ ہم کبھی نہ آتے۔" وہ ازلی سرد انداز میں بولی تو البرٹ گردن نفی میں ہلانے لگا تھا۔

"میں یہاں اپنی وجہ سے نہیں آیا۔ بلکہ آپ کی وجہ سے آیا ہوں۔" وہ مسکراہٹ لبریز آواز میں بولا تو یاسمین کے قدم سست ہوئے۔

"ہم سمجھے نہیں؟" وہ الجھ گئی۔

"ہاں تو اور کیا۔ میں نے تو آپ کو پہلے ہی مطلع کر دیا کہ مجھے کلچے میں دلچسپی ہے۔ ادھر تو میں آپ ہی کے لیے آیا ہوں۔ آپ کو ضرورت ہے آرام کی۔ خود کے ساتھ وقت گزارنے کی۔ قدرت میں گھومیں۔ تھوڑا مسکرائیں۔ قدرت کے کرشموں سے محظوظ ہوں۔ معلوم نہیں، لیکن آپ کو دیکھ کر لگتا ہے جیسے آپ زندگی جینا نہیں جانتی۔" البرٹ اپنی دھن میں بولتا گیا، جب کہ یاسمین کی آنکھیں بدقت مرجھا گئیں۔

"ہنسنا مسکرانا، زندگی جینا۔" اس نے تھکی سانس خارج کی۔ "یہ سب کچی عمر میں ہی اچھا لگتا تھا۔ اب تو بس۔ بس زندگی ہے اور مصروفیات۔" اس کی آواز وزنی محسوس ہوئی۔

"تو آپ کی عمر کتنی ہے؟" وہ متجسس ہوا، اور بھنویں سکیڑ کر پوچھنے لگا۔

"اٹھائیس برس۔"

جواب سن کر البرٹ ہنس دیا۔

"بس اٹھائیس برس؟ اتنی سنجیدگی تو ہمارے بزرگ بھی اختیار نہیں کرتے، جتنی آپ کرتی ہیں یاسمین۔ ہاں، ناکام کی مصروفیات ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ جینا ہی چھوڑ دیں؟" وہ اپنے معصومانہ انداز میں اس کی دل جوئی کرنے لگا۔

یاسمین نے ٹھہر کر، لحظہ بھر اس کی شہد رنگ آنکھوں میں جھانکا۔ وہ اس کے لیے بے چین لگتی تھیں، جیسے وہ دل سے اسے خوش دیکھنا چاہتا ہو۔

"آپ کے لیے کہنا آسان ہو گا۔ آپ کے لیے خوش رہنا آسان ہو گا۔ ہمارے لیے نہیں ہو سکتا۔" وہ اس کے چہرے سے نظریں پھیرتے، مضطرب انداز میں بولی۔

اس بات پر البرٹ نے گردن نفی میں ہلائی۔

"مجھے لگتا ہے کہ زندگی میں چاہے جتنے بھی غم کیوں نہ ہوں، ہمیں پھر بھی خوش رہنا چاہیے۔ یہ بھلا کیا بات ہوئی کہ پریشانیوں میں انسان جینا ہی چھوڑ دے؟ یا ذمہ داریوں کے بوجھ تلے زندگی سے بے بہرا ہو جائے۔"

"یہ باتیں کرنا آسان ہوتی ہیں البرٹ۔ لیکن عمل کرنا انتہائی مشکل کام ہے۔"

اس گفت و شنید کے سلسلے کے دوران وہ باغ کے وسط تک پہنچ چکے تھے۔ البرٹ کچھ بولنے ہی لگا تھا کہ اس کی نظر، سامنے کھڑے اس بلند و بالا سفید محل پر پڑی۔ وہ آنکھوں میں اشتیاق لیے اسے دیکھنے لگا۔

"اسے سمر پیلیس بھی کہتے ہیں۔" یاسمین اس کی آنکھوں میں دلچسپی کو بھانپ کر وضاحتیں دینے لگی۔

"ماہراجہ رنجیت سنگھ نے امرتسر فتح کرنے کے بعد باغ میں تعمیر کروایا تھا۔"

البرٹ نے سر اوپر نیچے ہلایا۔

"آپ کو تاریخ میں دلچسپی ہے؟"

"نہیں۔ لیکن اپنے شہر کی تاریخ جانتی ہوں۔ سب ہی جانتے ہیں۔" اس نے البرٹ کی ان چمکتی آنکھوں میں اپنی بے جان آنکھیں ڈالیں۔

جہاں شہد رنگ آنکھوں میں زندگی جینے کا ذوق تھا، لگن تھی تو وہاں سیاہ آنکھیں، زندگی کی رونقوں سے محروم تھیں، جو ایک عالی شان محل کے دیدار پر بھی نہ بدلیں۔ کیا تھا جو ان آنکھوں کی ویرانی کا سبب بنا ہوا تھا؟

"اندر جائیں گی میرے ساتھ؟" البرٹ نے ادب سے درخواست کی۔

"آپ ہو آئیں۔ اندر بت ہیں اور ہم جانہیں سکتے ہیں۔ ہم باہر ہی آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

البرٹ نے مایوس کن سانس خارج کرتے سر اوپر نیچے ہلایا اور اندر چلا گیا۔ تاریخ کے ان شاہکاروں میں، اسے خاص دلچسپی تو نہ تھی، مگر سمر پیلس کی خوبصورت عمارت نے اسے اندر جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

فرش پر سفید ٹائلز بچھے ہوئے تھے اور دیواروں پر سرخ پینٹ تھا۔ دیواروں پر مصوراتی شاہکار بھی لٹکے ہوئے تھے اور شیشوں کے بکسوں میں ماہراجہ رنجیت سنگھ کا سامان قید تھا۔ جیسے کہ تلواریں، ان کا کوچ اور ان کی پگڑی بھی۔ البرٹ ہر ایک ایک چیز کا جائزہ لینے لگا۔ ان سب اشیاء کو دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ ہم سے پہلے بھی ایک وقت گزرا ہے، جو ہمارے وقت سے بہت مختلف تھا۔ جہاں لوگ بہت مختلف تھے ان کی جدوجہد مختلف تھی، ان کی ترجیحات بھی ہم سے کافی مختلف تھیں۔

وہ باہر آیا تو چہرے پر ایک تازہ دم مسکراہٹ تھی اور شہد رنگ آنکھوں میں روشنیاں بھری ہوئی تھیں۔

وہ گردن دائیں بائیں گھماتے، متلاشی نظروں سے یاسمین کو ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ اس کی نظر، باغ کے ایک سر سبز حصے پر گئی جہاں یاسمین دو بچوں کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اپنے بٹوے سے چند سکے نکال کر ان کے ہاتھوں میں تھما رہی تھی۔

البرٹ مبہوت نگاہوں سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ دل شادماں تھا اور لبوں پر آسودہ مسکراہٹ رقم تھی۔ فیاض اور سخی ہونا کیسا ہوتا ہے، اس نے یاسمین سے سیکھا تھا۔

وہ یاسمین کی طرف بڑھا اور اس کے پیچھے جا کر کھڑا ہوا۔ یاسمین کو اس کی موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔

وہ کھڑی ہوئی اور بچے اس سے تشکر کا اظہار کرتے، وہاں سے چلے گئے۔

"لیڈی یاسمین۔ مجھے لگتا ہے، جیسے آپ اپنی محرومیوں کے باعث ہر کسی پر اس قدر مہربان ہیں۔ بالکل ایمیلی کی طرح۔" وہ ایسے بولا جیسے اس پر کوئی نیا انکشاف ہوا۔

یاسمین الجھ گئی۔

"ایملی کون؟"

”میرے ناول کا ایک کردار ہے۔ لیکن اس کی بھی یہی خصلت تھی۔ چونکہ اس نے زندگی میں سب کچھ گنوا دیا تھا، بس اس لیے دوسروں کے لیے وہ روشنی کی کرن بن جاتی تھی اور یوں سمجھ لیں اپنے دل کے خانوں کو، جو کہ محبت سے خالی ہیں، دوسروں سے محبت کر کے، بھر دیا کرتی تھی۔“

اس کی تھیوری سن کر یاسمین کے لب پھیلے اور مسکراہٹ جلد کھکھلاہٹ میں تبدیل ہوئی۔ البرٹ کے لب پھیلے۔ آنکھوں میں نرمی اتر آئی۔ مگر اس لڑکی کی کھکھلاہٹ میں خالی پن کیوں رقم تھا؟

”آپ کچھ زیادہ سوچتے ہیں البرٹ۔ ضروری تھوڑی کہ انسان کے ہر عمل کے پیچھے کوئی وضاحت چھپی ہو۔“ وہ مسکراہٹ دباتے بولی۔

البرٹ نے آنکھوں کے تاثرات بحال کیے۔

”معلوم نہیں کہ میرے اندازے درست ہیں کہ نہیں۔ غالباً آپ میری بات سن کر ہنس دیں میرے لیے یہی کافی ہے۔ سچ بولوں تو آپ کو بھی خوش و خرم رہنا چاہیے۔ جب آپ ان بچوں کو سکے دے رہی تھیں تو ان کے چہروں پر نظر ڈالی تھی؟ کتنے خوفزدہ تھے۔ اگر یہی عمل آپ مسکرا کر کرتیں تو ان کی خوشیاں دوبالا ہو جاتیں یاسمین صاحبہ۔ زندگی کی تلخیوں کو اپنی شخصیت کا حصہ نہیں بنانا چاہیے۔ میرا تو یہی ماننا ہے۔“ اتنا چلنے کے بعد پاؤں درد کرنے لگے تھے، اس لیے وہ بینچ پر بیٹھ گیا۔

”ہم وہی کہیں گے جو کچھ دیر پہلے کہہ چکے۔ باتیں کرنا آسان ہوتی ہیں، ان پر عمل نہایت مشکل ہے۔ لیکن ہم کوشش ضرور کریں گے۔“

آخر میں البرٹ مسکرا دیا۔

”چلیں پھر۔ کلچے کھانے چلیں؟“ ٹانگوں کو راحت آئی تو وہ کھڑا ہوا۔

یاسمین نے سر دمہری سے سر اوپر نیچے ہلایا۔

وہ لوگ رام باغ سے باہر آئے۔ تھوڑی سی چہل قدمی کے بعد ایک ٹھیلا نمودار ہوا، جہاں تازہ تازہ گرمہ گرم امرتسری کلچے بنائے جارہے تھے۔

"اوہ نو!" البرٹ کے چہرے پر مایوسی ابھری۔ کلچے والا تندور سے کلچے لگا رہا تھا۔

"سب خیریت ہے؟" یاسمین نے پوچھا۔

"مجھے اسے بنتے ہوئے دیکھنے کا بہت شوق تھا۔" اس نے خفگی سے سر جھٹکا۔

اب وہ آدمی ایک لمبی سی راڈ سے کلچے پلٹ رہا تھا۔

"ہم بتادیں گے۔ امرتسری کلچے تو امرتسر کی شان ہیں۔ انہیں بنانا تو عورت عورت کو آتا ہے۔" وہ شان سے بولی تھی۔

"بس پھر ٹھیک ہے۔" البرٹ کا موڈ بحال ہوا۔

یاسمین بھی اسے مسکراتا دیکھ کر مبہم سا مسکرادی۔

ٹھیلے والے نے الومینیم کی پلیٹ میں کلچے کا چکور پیس ڈالا اور پھر ساتھ پیالوں میں چھولے بھرے اور املی پیاز کی چٹنی بھی۔ ان کلچوں سے بڑی زبردست قسم کی خوشبو آرہی تھی جس سے البرٹ کے منہ میں پانی بھر گیا تھا۔

کلچوں کو لے کر وہ یاسمین کے سنگ ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔

البرٹ نے پہلے تو کلچے کے ہر ایک زاویے کو بغورا۔ وہ بھورا تھا، کناروں سے گہرا بھورا اور کہیں کہیں سنہرا اور زرد بھی۔ اس کے اوپر دیسی گھی کا چھڑکاؤ ہوا تھا اور کلونجی اور تل بھی چھڑکے گئے تھے اور نکھار کے لیے اس پر ہرا دھنیا بھی ڈالا تھا۔

البرٹ نے پورا کلچا ہاتھ میں اٹھایا، اور اس کا ایک لقمہ بھرا۔ کلچہ نہایت کرارا تھا۔ منہ میں جاتے ہی کڑک آواز کے ساتھ چکنا چور ہو گیا۔ لذیذ ذائقہ اس کی زبان سے ٹکرایا۔ وہ چٹپٹا تھا اور اس میں بیشتر مصالحوں کی آمیزش

تھی۔ اس میں آلو کا خاص ذائقہ تھا اس کے ساتھ وہ مٹر، پیاز، کو بھی محسوس کر سکتا تھا۔ اسے اب سمجھ آیا تھا کہ یہ کلچے آخر اتنی شہرت کے حامل کیوں تھے۔

وہ دنیا سے ہوش کھو بیٹھا تھا اور پورا کلچا جھٹکے میں کھا گیا۔ جب کلچا ختم ہو گیا تو جیسے وہ بیدار ہوا اور گردن موڑ کے یاسمین کو دیکھنے لگا جس نے آدھا کلچا کھا لیا تھا اور باقی بچا لیا۔ یاسمین اٹھ کر سڑک پار ایک عورت کی طرف گئی جو کہ زمین پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے بچا یا ہوا کلچہ اس عورت کے سپرد کر دیا۔

البرٹ یہ پر خلوص عمل دیکھ مسکرائے بغیر رہ نہ پایا۔ وہ پھر سے اس کے برابر میں بیٹھی۔

"اب آپ مجھے بتائیں۔ یہ شاہکار بنتا کیسے ہے؟" اس نے ہاتھ جھاڑتے پوچھا۔

"پہلے ہم آٹا گوندھتے ہیں اور پھر اس آٹے کی دیسی گھی کے ساتھ پرت بناتے ہیں۔ کوئی بیس بائیس پرتوں کے بعد ہم آٹے کو ہاتھوں سے پھیلا لیتے ہیں اور اس میں اپنے مصالحے ڈالتے ہیں۔ اور پھر آلو کا مادہ ڈال کر اوپر ایک آخری تہہ لگا کر تندور میں سیک لیتے ہیں۔ اور یہ لیں۔ امرتسری کلچے تیار!" آخر میں اس نے شانے اچکا دیں۔

"واہ۔ واہ۔ اس لیے اس قدر خستہ تھے۔ ہم برطانیہ کے شہری تو نہ جانے کن کن عجوبوں سے محروم ہیں۔ مجھے تو ہندوستان کے اس پر ذوق کھانے کی اتنی بری لت لگ گئی ہے کہ اب ان کے بغیر زندگی تصور نہیں کر سکتا۔"

وہ کھکھلا کر سب بتا رہا تھا اور یاسمین بس اسے دیکھتی گئی۔ وہ مسکراہٹ کسی وبا کی طرح تھی۔ اس سے توانائی پھوٹتی تھی۔ البرٹ کے چہکنے سے اس کے دل میں مسرت بھرا احساس بھر جاتا تھا اور اس کا بھی اسی کے ساتھ مسکرانے کا دل کرتا تھا، اسی کے ساتھ کھکھلانے کا دل کرتا تھا۔

لیکن شاید۔ شاید اس بدلاؤ کی اسے عادت نہیں ہو رہی تھی۔ جب جب اس کا دل کھکھلانے کو چاہتا اسے اپنا ماضی یاد آتا تھا، اپنا اصل یاد آتا تھا۔ اور وہ اس کے دل میں سرگوشی کرتا تھا کہ: تمھارا ہنسنے کا کوئی حق نہیں۔ اور یکدم اس کے دل سے ہنسنے مسکرانے کی چاہ وفات پا جاتی۔ وہ اس وقت خود سے جنگ لڑ رہی تھی۔

شام ڈھلنے کو تھی، اس لیے البرٹ اور یاسمین نے واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ ایک بگھی پر سوار ہو گئے اور رام باغ گارڈن کو الوداع کہہ کر چلے گئے۔

.....☆☆☆.....

چمنِ گلاب میں معمول کی گہما گہمی تھی۔

وہ حسبِ معمول، دن کا پہلا گاہک تھا اور اپنی مخصوص کرسی پر براجمان، اخبار پڑھنے میں محو تھا۔

اخبار میں روزمرہ کی خبریں نشر تھیں۔ ملک میں کہیں، احتجاجیوں نے پولیس اہلکار کو جاں بحق کر دیا تو کہیں احتجاجی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ دن بہ دن، اس دیس کی مٹی میں خون کی ملاوٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ بگڑا ہوا منہ بنائے، اخبار پڑھ رہا تھا، جب اس کے کانوں میں قدموں کی چاپ پڑی۔ کوئی اس کے قریب آ رہا تھا۔

سامنے سے، کرسی کھسکنے کی آواز پیدا ہوئی، تو اسے آگہی مل گئی کہ اس کے سامنے کوئی بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے اخبار نیچے کیا، تو جیمس کا مسکراتا چہرا اس پر ظاہر ہوا۔ اس کے ہاتھ میں، البرٹ کی کتاب تھی۔

جیمس نے کتاب میز پر پٹخی اور لب "اوہ" میں ڈھالے، جیسے کوئی جنگ لڑ کر آیا ہو۔ البرٹ اس کے انداز دیکھ کر، لب کاٹتے مسکرایا۔ وہ جان گیا تھا کہ جیمس پر یہ کیفیت کس باعث طاری تھی۔

"اف البرٹ۔ اف! الفاظ تھے کہ جادو؟" وہ حصار میں بولا۔ "جس ڈیٹیکٹو سے اتنی محبت کروائی، آخر میں اسے ہی ولن بنا دیا؟ کوئی اس طرح سے کیسے سوچ سکتا ہے؟

پچھلی سات کتابوں میں ہونے والے قتل، اس نے خود ترتیب دیے تھے! آخر میں کیسے کڑی سے کڑی مل گئی اور ہم قاری تو البرٹ ونسٹن کی حکمتِ عملی کو داد دیتے رہ گئے۔" اس نے گہرا سانس خارج کیا۔ آنکھیں پرجوش تھیں۔

البرٹ کے گال سُرخ ہوئے۔ اسے وہ تمام خطوط یاد آئے، جو اس کتاب کی اشاعت کے بعد موصول ہوئے تھے۔ وہ دبا دبا سا ہنس دیا۔

"اپنے قارئین کو چکمہ دے کر اب تم ہنس رہے ہو؟" جیمس نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

"بالکل! کیونکہ، اپنے قارئین کو بھٹکانے کے لیے ہی تو میں نے یہ کتاب لکھی۔ شروع دن سے ڈیٹیکٹو کا کردار مشکوک تھا لیکن ہر کوئی اس کا مداح تھا۔ اسے ایک ذہین ہیرو کے طور پر تصور کیا جاتا تھا، جب کہ ڈیٹیکٹو دودھ کا دھلا نہ تھا۔ اس کتاب کے بعد میرے قارئین، کبھی دنیا کو پہلی نظر سے نہیں دیکھ پائیں گے۔" وہ فخر سے بولا۔ اپنے کام کے بارے میں بات کرتے کرتے اس کی چھاتی پھول جاتی تھی اور ہاتھ تیزی سے حرکت کرنے لگتے۔

"درست فرمایا۔ میں تو کبھی اس جھٹکے کے بعد نارمل نہیں ہو سکتا۔" جیمس نے گہرا سانس لیا۔ اب وہ بالکل نارمل ہو گیا تھا۔

"خیر البرٹ صاحب۔ آپ کو یہ بیکری شاید کچھ زیادہ ہی بھا گئی ہے۔" اب کہ اس نے کہنی میز پر رکھی اور گردن جھکائی۔ انداز رازدارانہ تھا اور معنی خیز بھی۔

اس اچانک سے کیے گئے سوال نے البرٹ کو عجیب کیفیت سے دوچار کیا۔ دل ہی دل میں، وہ مشکوک ہونے لگا تھا، مگر اس نے خدشات کو نظر انداز کر کے جواب دیا۔

"بالکل۔ یہاں کی سوغات! آپ بھی کھائیں گے تو دیوانے ہو جائیں گے۔"

جیمس کی مسکراہٹ اب گہری ہونے لگی تھی۔

"صرف سوغات میں ہی دلچسپی ہے، یا ماجرہ کچھ اور ہی ہے؟"

البرٹ کی مسکراہٹ بھک سے اڑ گئی۔

"بالکل۔ مجھے صرف اور صرف ان کیکس پیسٹریز اور بریڈز میں دلچسپی ہے، مسٹر جیمس۔" انداز میں نیم سختی تھی۔

"پکا؟ ایسا تو نہیں کہ چمنِ گلاب کی ملکہ کی وجہ سے کھینچے چلے آرہے ہو؟"

البرٹ کے چہرے پر ناگواری ابھری۔ دل مضطرب ہونے لگا۔ اسے جیمس کے ارادوں کے پاک نہ ہونے کی آگہی مل گئی تھی۔

.....☆☆☆.....

چمنِ گلاب کے باورچی خانے میں ہر سو ہر دم چاکلیٹ بسکٹس، بادام کی خطائیوں اور ڈبل روٹی کی مہک معدوم تھا۔ باخدا، ان خوشبوؤں کے باعث اس جگہ سے جنت جیسا گمان ہوتا تھا۔

یاسمین میز کے پیچھے کھڑی تھی۔ اس کے سامنے تھال تھی جس میں ڈبل روٹی کا آٹا موجود تھا۔ اس کے اضافی ہوا کے بلبلوں کو، وہ نکال چکی تھی، اب ان کے پیڑے بنا بنا کر، سانچوں میں ڈال رہی تھی۔ ملازمائیں اپنے کاموں میں مصروف تھیں۔ پس منظر میں وقتاً فوقتاً دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آرہی تھی۔

"کیسی ہو یاسمین۔" جنت کی شناسا آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تو اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔

"سلام جنت۔ کیسی ہیں آپ؟" کچھ دیر اپنا کام روک کر سر کو خم کے اس نے جنت کو سلام کیا۔

جنت اس کے سامنے ایک کرسی پر براجمان ہوئیں اور میز پر ایک پیالی رکھی۔

"احمد اور حماد کی سالگرہ تھی تو سوچا تمھاری پسند کی، پستے اور بادام والی خالص دودھ کے کھوئے کی مٹھائی لے آؤں۔ کھا کر ضرور بتانا کیسی لگی۔"

یاسمین لبوں پر پھیکی مسکان سجاتے کام میں مشغول ہو گئی۔

"بچوں کو ہماری جانب سے سالگرہ کی مبارکباد ضرور دیجیے گا جنت۔" آواز سرد تھی۔

"دے دوں گی۔ دے دوں گی۔" وہ کہہ کر خاموش ہوئیں۔

کچھ لمحے باورچی خانے میں دروازہ بند کھول ہونے کی آوازیں نہ آئیں۔ بس آٹے کے پیڑوں کی سانچ میں اترنے کی آواز غالب تھی۔

"یاسمین۔ باہر وہ گورا بیٹھا ہوا ہے۔ کیا کام ہے اس کا یہاں؟" انداز مشکوک تھا۔ "وہ تو روز ہی یہاں آتا جاتا دکھائی دیتا ہے۔"

"جی جی۔ گاہک ہے وہ۔" یاسمین نے آٹے کا پیڑا سانچے میں پٹخا اور سرسری انداز میں جواب دیا، جیسے جنت کے انداز کا اس نے کوئی اثر نہ لیا ہو۔ "روز کچھ خریدتا ہے۔ اخبار پڑھتا ہے اور چلا جاتا ہے۔"

"یاسمین۔ کیا تم یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہو کہ وہ آدمی نیک نیت ہے؟"

یاسمین نے نظریں اٹھائیں اور بھنویں نیچی کیں۔

"جی بالکل۔ اس نے اب تک کچھ نہیں کیا۔ ہم کسی پر بے جا شک نہیں کرتے۔" اس نے اپنی طرف سے ایک تسلی بخش جواب دیا تھا لیکن جنت مطمئن نہ تھی۔

.....☆☆☆.....

"برادر۔ تم میرے وطن کے شہری ہو۔ میرے بھائی کی طرح ہو۔ ایک بھائی اب دوسرے بھائی سے اتنا تو کہہ سکتا ہے؟" وہ جان گیا تھا کہ البرٹ کو اس کا انداز بالکل نہ بھایا تھا۔ اس لیے، اس نے بات کو سنبھالنا چاہا۔

البرٹ اس پر خلوص جملے پر مسکرا دیا، مگر دل اب بھی اس آدمی کی موجودگی پر کچھ بے چین تھا۔ وہ کسی بھی طرح سے، یہاں سے چلا جانا چاہتا تھا۔

"غالباً، دل تو کسی پر بھی آسکتا ہے۔ محبت دھرم دیکھ کر تھوڑی کی جاتی ہے۔ وہ تو ہندو سے بھی ہو سکتی ہے، سکھ سے بھی۔ اور ایک مسلمان سے بھی۔" اس نے انداز دوستانہ رکھا۔

البرٹ نے جھرجھری لی۔ جیمس کی باتیں اس کے دل میں خلش سی پیدا کر رہی تھیں۔

"نہیں جیمس۔ ایسی کوئی بھی بات نہیں ہے۔ تم ایک غلط نتیجے پر پہنچے ہو۔"

جیمس نے اسے بھائی کہہ دیا تھا، اس لیے وہ چاہ کر بھی سخت نہ ہو سکا۔ اس کا نرم دل کبھی کبھی اس کی کمزوری بن جاتا تھا۔

.....☆☆☆.....

"میں تمہیں خبردار کروں گی کیونکہ، تمھاری بڑی بہن ہونے کی بحیثیت اسے اپنا فرض مانتی ہوں۔" یاسمین کا کام کرتا ہاتھ سست ہوا۔ "اس انگریز سے فاصلہ اختیار کر لو یاسمین۔ اسی میں تمھاری عافیت ہے۔" آواز دبی دبی تھی۔

"آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں جنت؟ ہم نے کیا ہی کیا ہے؟" وہ گردن اٹھاتے، متحیر نظروں سے جنت کو تکنے لگی۔

"تم اس دن اس کے ساتھ بگھی میں گئی تھی، یاسمین۔ یہ بات صرف میں ہی نہیں کہہ رہی، ہمارے محلے میں بھی پھیل گئی ہے۔ میں تمہیں شک کا نشانہ نہیں بنا رہی، مجھے تمھارے اوپر بھروسہ ہے۔ لیکن مجھے اس انگریز پر بھروسہ نہیں۔"

یاسمین نے ہاتھ ڈھیلے چھوڑ دیے۔ اپنی کاٹ دار آنکھوں سے وہ جنت کو دیکھنے لگی۔ پیشانی پر تفکر آمیز لکیریں ابھری تھیں۔

.....☆☆☆.....

"میں سال پہلے، ایک مسلمان لڑکی کی محبت میں گرفتار ہوا تھا۔ انجام جانتے ہو کیا نکلا؟ اس نے مجھے دھتکار دیا۔"۔ لہجے میں کڑواہٹ ابھری، چہرے پر کرب جھلکا۔

البرٹ کی نگاہیں ترحم ہوئیں۔

"یہ ایک کڑوی حقیقت ہے کہ یہ ہندوستانی، چاہے مسلمان ہو، ہندو ہو یا سکھ، یہ کبھی بھی ہمارے دوست نہیں بن سکتے۔ یہ کبھی بھی ہمارے اوپر اعتبار نہیں کر سکتے۔ یہ کڑوی حقیقت ہے، لیکن جتنی جلدی ہو سکے اس کڑواہٹ کو پی لو، ورنہ میری طرح اپنے لیے تکلیف کا سامان کر بیٹھو گے۔"

البرٹ کی بے قراری اپنے عروج کو پہنچی۔ اسے جیمس شدید کھل رہا تھا لیکن وہ کچھ بھی الٹا سیدھا کہہ کر اسے تکلیف دینا نہیں چاہتا تھا۔

"جب بھی کوئی آفت آئے گی، تو یہ ہمیں ہی قصوروار ٹھہرائیں گے۔ خود مظلومیت کا لبادہ اوڑھ کر سڑکوں پر نکل آئیں گے۔ یہی تو ان کا مسئلہ ہے، چاہے آفت ان کی خود کی گڑھی ہوئی ہو، یہ کبھی بھی اپنی غلطی نہیں مانیں گے، اپنی عدم اعتباری کا نشانہ ہمیں بنائیں گے۔ یہ ان کی فطرت میں ہے البرٹ۔"

البرٹ نے نظریں نیچی کر لیں۔ جیمس کی شدت پسند باتیں اسے جواب دینے لائق بھی نہ لگیں۔ وہ کیوں ایسے جانبدار اور نفرت آمیز نظریے پر اپنے الفاظ ضائع کرتا؟

"میں تو تمہیں مستقبل میں ملنے والی تکلیف سے بچانا چاہ رہا ہوں۔ میں نہیں چاہتا تم بھی کبھی وہی سب جھیلو جو میں نے جھیلا۔" جیمس اپنا خاکی یونی فارم جھاڑتے کھڑا ہوا۔

وہ جانے لگا، تو البرٹ کی اٹکی سانسیں جاری ہوئیں۔

"ٹھیک ہے پھر۔ اپنا خیال رکھنا۔" البرٹ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے وہ وہاں سے چلا گیا۔

البرٹ نے ایک گہرا سانس بھرا جیسے دنیا کی تمام آکسیجن اسے اسی وقت ملی ہو۔

دماغ میں طرح طرح کے شکوک و شبہات جنم لینے لگے تھے لیکن یہی سوچ کر اس نے خود کو پر سکون کر لیا تھا کہ عنقریب اس کا یہ قیام ختم ہونے والا ہے۔ اسے بس اپنی کتاب کو توجہ دینی ہے۔ جیمس کی باتیں، بے بنیاد ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے دل کو تسلی دی۔

.....☆☆☆.....

"لیکن۔۔۔ شاید البرٹ کچھ مختلف ہے۔" وہ ایسے بولی جیسے خود بھی اپنی بات پر دورائے کا شکار ہو۔

"نہیں یاسمین! یہ سب ایک جیسے ہیں۔" وہ اب کھڑی ہوئیں۔ سرگوشانہ انداز میں سلسلۂ کلام جوڑا۔

"سب کے سب ایک جیسے ہیں! وہ بھی اس جنرل ڈائر کی نسل کا ہے جس نے جلیاں والا باغ میں گولیاں چلوائی تھیں!" اب کہ لہجے میں کڑواہٹ بھرنے لگی تھی۔

یاسمین کی نظریں بے ساختہ جھک گئیں۔ جلیاں والا باغ سانحہ ان سب کی دکھتی رگ تھا۔

"کیا لگتا ہے تمہیں؟ کیا تم کر سکتی ہو اس پر اعتبار؟ اپنے دل سے رائے طلب کرو۔ جب اسے دیکھتی ہو، تو یہ خیال نہیں آتا کہ وہ تم سے مفاد پرستی کی بنیاد پر جڑا ہے؟ یاسمین۔ ہم اتنی آسانی سے ان کے آگے نہیں جھک سکتے ہیں۔"

ان کی تیز چلتی سانسیں یاسمین کو سنائی دے رہی تھیں۔ جنت پیچھے ہوئیں۔ چہرا جذبات کی شدت سے لال بھبوکا ہو چکا تھا۔

اسے خود سے دور جاتی قدموں کی چاپ سنائی دی، اور پھر دروازہ ٹھپ سے بند ہو گیا۔ وہ کسی بت کی طرح، اپنی جگہ پر منجمد رہی۔ دماغ ایک خدشے سے دوسرے خدشے کا سفر طے کر رہا تھا۔ جنت کی باتوں نے اسے مضطرب کر دیا تھا۔

"اپنے دل سے رائے طلب کرنا یاسمین۔" یاسمین کو جنت کا جملہ یاد آیا۔

ان کی پیش کش پر عمل کرتے اس نے دل سے رائے طلب کی۔

اور دل سے بس ایک ہی آواز آئی۔

البرٹ مختلف ہے!

.....☆☆☆.....

رات کی سیاہی میں، بادلوں نے آسمان پر چادر اوڑھی ہوئی تھی۔ بادلوں کی ان تہوں کے پسِ پشت، بدر چھپن چھپائی کھیل رہا تھا۔

نیم ٹھنڈی مگر خشک ہوائیں اس گلی سے گزر رہی تھیں، جس کے دائیں اور بائیں طرف، بھوری عمارتیں کھڑی تھیں۔ اس نے کندھے پر بھورا پرس لٹکایا ہوا تھا۔

ہوا کا جھونکا اس کے وجود سے ٹکرایا تو اس کا ڈوپٹہ لہرایا۔ اس نے بلا تاخیر اسے درست کیا۔ گلی میں سکوت طاری تھا، بس اس کے قدموں کی چاپ پر ہی سکوت ٹوٹتا۔

اس سے فاصلے پر، وہ ایک گلی سے سر ٹکائے اسے دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں میں جانچ پڑتال کا ازلی تاثر لیے، وہ محتاط ہو کر چل رہا تھا۔

وہ جیسے ہی ایک گلی سے دوسری گلی میں سفر کرتی وہ چلنا شروع کرتا اور اس کے قدموں کا تعاقب کرتا۔ وہ اونچی سانس لینے سے بھی گریز کر رہا تھا۔

دفعتاً وہ ایک گھر کے باہر رکی۔ گردن ہمیشہ کی طرح ترشان اکڑی ہوئی تھی۔ اس نے ہاتھ کی مٹھی بنائی اور دروازے پر دستک دی۔ اسی وقت اس کا ڈھیلا ڈھالا کرتا ہوا کے جھونکے سے لہرایا۔ کچھ دیر میں دروازہ کھل گیا۔

بوڑھے وجود نے مسکرا کر سیدہ یاسمین مجاہد کا استقبال کیا اور وہ تحکم سے گھر کے اندر داخل ہوئی۔

تعاقب کار نے جیب میں ہاتھ ڈال کر واکی ٹاکی نکالی۔ اب کہ اس کا خاکی یونی فارم زرد روشنی میں واضح ہوا اور اس کے سینے پر لگا بیج بھی۔ جس پر اس کا نام درج تھا۔ بلاشبہ، وہ جیمس تھا۔

"ولیم۔ یہاں پہنچ جاؤ۔ آج تو یہ پکڑی جائے گی۔" اس نے واکی ٹاکی میں معنی خیز سرگوشی کی، اور اسے جیب میں ڈال کر لبوں پر فتح کن مسکراہٹ سجائی۔ چمنِ گلاب کی ملکہ، اب اس کے وار سے بچ نہیں پائے گی۔

.....☆☆☆.....

کمرے میں، کھڑکی کے ساتھ ایک بستر تھا، جس پر بوڑھا وجود سیدھ میں لیٹا ہوا تھا۔ ان کے سرہانے کرسی پر یاسمین براجمان تھی۔ کمرے کی فضا میں پراسرار خاموشی کا بسیرا تھا۔

یکبارگی یاسمین کے چہرے کے زاویوں میں تبدیلی آئی۔ اس کے لبوں پر مبہم، مگر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے ہاتھ کی مٹھی ہوا میں بلند کی۔

"ایک!" انگشت شہادت نکالی۔

"دو۔" دوسری انگلی نکالی۔

"تین!" تیسری انگلی مٹھی سے آزاد ہوتے ہی دروازے پر دستک ہوئی۔

جہاں وہ زیر لب ہنس دی وہاں وہ بوڑھا وجود متاثر کن نظروں کے ساتھ مسکرا دیا۔

اس نے چہرے کے تاثرات بحال کیے، اور دروازے کا رُخ کیا۔ دروازہ کھولا تو دو شناسا چہرے نمایاں ہوئے۔ وہ جیمس اور ولیم تھے۔ جیمس سربراہی کر رہا تھا، اور یاسمین کو جتاتی نگاہوں سے گھور رہا تھا۔

"امید کرتا ہوں آپ بخیریت ہوں گی، لیڈی۔" لب تپاتی مسکراہٹ میں پھیلے۔

یاسمین نے چہرے کو سرد سپاٹ رکھا۔

"میں تلاشی لینے آیا ہوں۔" وہ مسکراہٹ سمیٹتے، اپنی گردن کو ترچی کرتے بولا۔

"شوق سے لیں۔" اس کا ٹھنڈا برفیلہ، مگر پر اعتماد انداز جیمس کو متذبذب کر گیا تھا۔

بہر حال، تلاشی کا سلسلہ شروع ہوا۔ جیمس اور ولیم نے گھر کا کونا کونا چھان مارا، درازیں کھنگالی، الماریاں خالی کیں، یہاں تک یاسمین کا پارس بھی چھان لیا۔ مگر افسوس، ان دونوں کو وہاں کچھ بھی قابلِ اعتراض نہ ملا۔

ہار تسلیم کر کے، ولیم کے سنگ وہ واپس کمرے میں آیا۔ اس کی کڑوی کسیلی نگاہ کا، یاسمین کی سرد نظروں سے تبادلہ ہوا۔

"اگر آپ کو لگتا ہے کہ آپ زیادہ دیر آزاد رہ پائیں گی، تو یہ آپ کی بھول ہے، لیڈی یاسمین۔ جیمس جس کے پیچھے پڑ جائے، اسے بخشتا نہیں ہے۔" اس نے دھمکی آمیز مسکراہٹ، یاسمین کی جانب اچھالی۔

"ہم آپ کا انتظار کریں گے۔" یاسمین نے گردن اکڑا کر، بدستور روکھے پن کے ساتھ جواب دیا۔

جیمس نامحسوس انداز میں پیر پٹختے وہاں سے چلا گیا۔ مگر اب یاسمین کو سلاخوں کے پیچھے بھیجنے کا یہ حکم، ایک حکم سے زیادہ انا کا کھیل بن گیا تھا۔ وہ ایک ہندوستانی عورت سے مات نہیں کھا سکتا تھا۔

ان کے جانے کے بعد یاسمین غسل خانے میں بند ہوئی۔ اس نے اپنا کرتا اٹھایا۔ اس کی کمر کے گرد کپڑا بندھا ہوا تھا، جس کے اندر کاغذات کے پلندے تھے۔

وہ ان کاغذات کے ساتھ کمرے میں لوٹی، اور انہیں میز پر پٹختے کرسی پر براجمان ہوئی۔

سیاہ آنکھوں میں تفکر کا گزر ہوا۔

بوڑھا وجود، اس کے بولنے کا انتظار کر رہا تھا۔

"اکبر چچا۔ ہمارا تعاقب ہونے لگا ہے۔ اور تو اور ہمیں گرفتار کرنے کی کوشش یہ لوگ پہلے بھی کر چکے ہیں۔ کیا اگلی باری ہماری ہے؟" اس کی آنکھیں سوچ سے چھوٹی ہوئیں۔

بوڑھے اکبر نے اس لڑکی کو اوپر سے نیچے دیکھا۔ وہ ان کی آنکھوں کے سامنے بڑی ہوئی تھی۔ انھوں نے اسے تبدیل ہوتے دیکھا تھا۔ کڑوا، تلخ بنتے دیکھا تھا۔ اور اس کے کرخت چہرے کو دیکھ کر، انہیں ایک بار پھر پرانی یاسمین یاد آئی۔ آنکھوں میں کچھ چھناکے سے ٹوٹ گیا۔

"آپ کو ڈر نہیں لگتا بیٹی؟ آگے ایک طویل زندگی آپ کی منتظر ہے۔" آواز میں لغزش تھی۔

یاسمین کی آنکھوں کی سختی فنا ہوئی۔ آنکھوں میں محرومی لیے اس نے کمزور سے وجود کو دیکھا۔

"خوفزدہ وہ ہوتے ہیں جن کے پاس کھونے کو کچھ ہوتا ہے۔ ہم نے تو اپنے باپ بھائیوں کو جلیاں والا باغ میں کھو دیا اور۔۔۔" گلے میں آنسو کا پھندا اٹکا، تو وہ آگے کچھ نہ بول سکی۔ آنسو بہنے کی تمنا کر رہے تھے، مگر ان کی خواہشات کو ٹھوکر کیسے مارنی ہے، وہ اتنے عرصے میں تو سیکھ ہی گئی تھی۔

وہ یک ٹک اس لڑکی کو دیکھ رہے تھے۔ جو وہ کہنا چاہتی تھی، وہ جانتے تھے۔ ماضی کے زخم ایک بار پھر کرید گئے تھے۔ لالٹین کی زرد روشنی میں نہایا کمرہ، پر فسوں ہوا چلا تھا۔

"اللہ تمہیں ایک لمبی زندگی دے، یاسمین!" اب کہ ان کی آواز رنجیدہ ہوئی۔

اس نے اپنی آنکھوں میں سرد مہری طاری کی۔ وہ خود کو جذبات میں بہہ جانے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔

"ہماری لمبی زندگی معنی نہیں رکھتی ہے۔ لیکن ہمارا مقصدِ آزادی معنی رکھتا ہے۔ اور اس مقصد کو تکمیلیت تک پہنچانے کے لیے، ہم ہر حد عبور کر سکتے ہیں۔" انداز شعلہ باز تھا، مگر آنکھیں برف کی طرح ٹھنڈی۔

اکبر نے سرد سانسیں خارج کیں۔ آنکھوں میں مایوسی کا گزر ہوا۔

"کیا آزادی کے خواب اب بھی دیکھنے چاہیے، یاسمین؟ اپنے دل سے پوچھیں، کیا آپ کے دل میں، اب بھی امید کی شمع روشن ہے۔" وہ مایوس کن لہجے میں بولے۔

یاسمین کے چہرے پر خون کی روش دوڑی تو اس کے گال سُرخ ہوئے۔ سیاہ آنکھوں میں جنون اتر گیا۔

"بالکل!" اس نے گردن اکڑائی۔ "ہمارے دل میں اب تک امید کے دیے روشن ہیں۔ اور پتہ ہے ان دیوں میں ایندھن کا سامان کون بنتا ہے؟ ہمارے لوگوں کا خون۔" وہ سینا پھلا کر، آواز میں جارحانہ تیور سجائے بولی۔ "وہ خون اس دیے کو لازوال روشنی بخشتا ہے، اکبر چچا۔ ہمارے لوگوں کا خون اتنا سستا نہیں کہ ہم ان کے مقاصد، یوں مایوسی کے شکنجوں میں گرفتار ہو کر بھلا بیٹھیں۔"

اس نے سانس لینے کو وقفہ لیا۔ اکبر کی گردن غیر دانستہ جھک گئی۔

وہ ان کی جانب بڑھی تو انھوں نے اسے نظر اٹھا کر دیکھا۔ سیاہ آنکھوں میں انہیں نمی دکھائی دی۔

"آئندہ خود کو مایوسی کی اس گھاٹی میں نہیں اترنے دیجئیے گا۔ وعدہ کریں۔ آج کے بعد ان آنکھوں کو آزادی کے خواب سے محروم نہیں کریں گے۔"

اکبر نے سر اوپر نیچے ہلایا۔ یاسمین پیچھے ہوئے۔ چہرے کا تناؤ ڈھیلا ہوا۔ اس نے مڑ کر میز پر پڑے، کاغذات کے پلندے کو دیکھا۔

"ہم نے یہ پوسٹرز بنوا لیے ہیں۔" وہ مدعے پر آئی۔ "اگر انہیں لگتا ہے کہ ہم جلیاں والا باغ کے بعد، اپنے خاندانوں کو گنوا کر سڑکوں پر نکلنا چھوڑ دیں گے تو یہ ان کی بھول ہے۔ ہمیں پھر سے جمع ہونا ہو گا۔ ہم پھر سے گلیوں میں نکلیں گے۔ آپ یہ تمام پوسٹرز، کل بازاروں میں بانٹ دیجیے گا۔"

کہہ کر اس نے سر پر ڈوپٹہ درست کیا۔ وہ جانے کے لیے تیار تھی۔

"ہو جائے گا، یاسمین۔ سب ہو جائے گا۔" آواز رقت آمیز تھی۔

اس نے سرد مہری سے گردن اوپر نیچے ہلائی۔

حالات نے اسے شدت پسند بنا دیا تھا اور وہ بھی اس شدت پسندی کو اپنا چکی تھی۔

"ہم اجازت چاہیں گے۔ اللہ حافظ۔" وہ مڑ گئی اور بستر پر لیٹا وہ بوڑھا وجود آنکھوں میں اضطراب لیے اس لڑکی کو دیکھتا گیا۔ دل سے اس کے ایک ہی دعا نکلی کہ اللہ یاسمین کو اپنے مقصد میں کامیاب کرے۔

.....☆☆☆.....

جمعے کا مصروف دن امرتسر کے باشندوں کو سلام پیش کر رہا تھا۔

ہمیشہ کی طرح سیدہ یاسمین مجاہد کو اپنی "بہنوں" سے ملنے جانا تھا۔ راشد کی صحتیابی میں وقت درکار تھا اس لیے آج بھی البرٹ نے اسے مدد کی پیشکش دی۔ جو کہ اس نے، ہچکچاتے ہوئے منظور کر لی۔ البتہ، آج وہ جلد مان گئی تھی۔

البرٹ نے ساری بوریاں ایک بگھی میں منتقل کیں۔ لیکن پچھلی بار کے برعکس وہ کچھ جلدی تھک گیا تھا۔ اور آخری کی تین بوریاں دونوں نے مل کر بگھی میں ڈالیں۔

وہ دونوں دوسری بگھی میں سوار ہوئے۔ اس بار یاسمین غیر آرامدہ نہ تھی بلکہ کافی پر سکون تھی۔ شاید البرٹ سے اب اسے کوئی خدشہ لاحق نہ تھا۔

گھوڑوں کی مخصوص ہنہناہٹ فضا میں گونجی اور بگھی جھٹکا کھاتے چل پڑی۔

"تمھاری کتاب کہاں تک پہنچی۔" اس کو تجسس ہوا تھا۔ آخری مرتبہ جب البرٹ نے اسے کتاب کا مرکزی خیال بتایا تھا تو اسے کتاب کافی دلچسپ معلوم ہوئی تھی۔

البرٹ کی شہد رنگ آنکھوں میں ایک عجیب سا تاثر ابھرا جیسے وہ یک دم پریشان ہو گیا ہو۔

"میں اپنی کتاب کا اختتام تلاش کر رہا ہوں۔ لیکن میں اسے ڈھونڈنے سے قاصر ہوں۔" یاسمین کی آنکھوں میں الجھن در آئی۔

"ہم سمجھے نہیں۔"

"اب کیسے سمجھاؤں۔" وہ سوچ میں پڑ گیا۔ "دیکھیں۔ ہر کتاب کا ایک اختتام ہوتا ہے۔ فکشن کا اختتام یا تو خوشحال ہو جاتا ہے، یا تو ہم سب کو ہی مار ڈالتے ہیں۔ اب میں اپنے سفر نامے کا اختتام لکھنا چاہ رہا ہوں لیکن سمجھ نہیں آ رہا۔ آس پاس کسی ایسے شے کا متلاشی ہوں جو مجھے ایک پر اثر اختتام لکھنے پر آمادہ کر دے۔"

اس کے چہرے پر پھیلی تفکر کی لکیری دیکھ کر وہ زیر لب کھکھلا دی۔ البرٹ نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"آپ ہنستی بھی ہیں؟" وہ شریر مسکراہٹ سجائے گویا ہوا تو یاسمین اور بھی زور سے ہنس دی۔

"ہم نے ہنسنا چھوڑ دیا تھا۔ مگر اب۔" وہ کہتے کہتے کسی سوچ کے تحت خاموش ہوئی۔

شہد رنگ آنکھوں کی شرارت فنا ہوئی۔ وہ ان سیاہ آنکھوں میں گھلتی سنجیدگی کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"اب؟"

"اب ہنسنے کا جی چاہتا ہے۔" وہ سرد مہری سے بولی، جیسے دماغ نے ایک بار پھر تبدیلی کی نفی کی ہو۔ کیسے عجیب عمل تھا ناں؟ دل کچھ اور کہتا تھا اور دماغ کچھ اور۔

"میں تو کہتا ہوں آپ جی بھر کر ہنسا کریں یاسمین۔ مسکرایا کریں۔ زندگی خوبصورت ہو جائے گی۔"

یاسمین نے اسے مڑ کر دیکھا۔ اس کی شہد رنگ آنکھیں کسی بھی طرح کے داغ و دھبے سے پاک تھیں۔ ان میں کوئی بری نیت نظر نہیں آتی تھی۔ وہ موسمِ سرمہ کی ان کرنوں کی مانند تھا جو کہ روح کا گوشہ گوشہ پر سکون کر دیتی تھیں۔

"تم واقعی اتنے خالص ہو یا بننے کا ناٹک کرتے ہو۔" وہ اسے دیکھتے استفہامیہ انداز میں بولی۔ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ اس نے مذاق کیا تھا یا دل کی گہرائیوں میں بسے وسوسوں کا ذکر کر بیٹھی تھی۔

"یہ تو آپ اپنے دل سے پوچھیں۔ کیا میری خوش اخلاقی ناٹک لگتی ہے آپ کو، مس یاسمین؟" وہ چہرے پر تبسم سجائے بولا۔

یاسمین نے گردن موڑ کر آنکھیں چھوٹی کیں۔ کیا واقعی، یہ ہنسنا کھکھلانا، یہ خوش اخلاقی، خوش کلامی سازش سے پاک تھی؟ اگر واقعتاً یہ سب ایک ناٹک تھا، تو بلا کا بہترین تھا۔

شام کی نیلاہٹ منظر سے سرک گئی اور رات کی سیاہی آسمان پر غالب آ گئی۔

وہ دونوں فارغ ہو چکے تھے اور واپسی کی سفر پر گامزن تھے۔ اس دفعہ البرٹ کو یاسمین کے اندر بعض تبدیلیاں نظر آئیں۔ وہ دبا دبا سا مسکرا دیتی تھی۔ اور نرمی سے گویا ہو جاتی تھی جیسے اپنے غم کے بنائے اس پنجرے سے آہستہ آہستہ رہائی پا رہی ہو۔ جہاں اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی تھی وہاں دل میں افسوس بھی ہوتا تھا۔ یاسمین تو اس کے سامنے صرف ایک مثال تھی، نہ جانے اور کتنے ہندوستانی ہوں گے، جو اسی کیفیت سے دوچار ہوں گے، جنہوں نے ہنسنا مسکرانا خود پر حرام کر دیا ہو گا؟

کوئی بھی انسان خوشیوں سے محروم ہو جانے کا حقدار نہیں!

"ویسے یاسمین۔ آپ کے کیکس اور بسکٹس کی تراکیب مل سکتی ہیں؟ میں انگلینڈ جا کر انہیں بناؤں گا ضرور۔" بگھی یاسمین کے گھر کی جانب روانہ تھی۔

"کبھی کسی ساحر کو اپنے راز بتاتے دیکھا ہے تم نے؟" وہ اسے دیکھتے سرد سے لہجے میں بولی۔

"نہیں دیکھا۔ البتہ آپ جادوگر نہیں بلکہ ایک بیکر ہیں، تاہم مجھے ساری تراکیب بتا دیں۔" وہ جیسے ضد کرنے لگا۔

"اب ہمیں یقین ہوا چلا ہے کہ آپ نے ناٹک رچایا ہے۔ اور حکمتِ عملی اتنی بھیانک بھی نہیں۔ پہلے امرتسر کی بہترین بیکر سے خوش اخلاقی سے پیش آئے اور پھر تراکیب کا مطالبہ آگے رکھ دیا۔" وہ شریر سے انداز میں طنز کرنے لگی۔

"اوپس۔ آپ نے تو میرے منصوبوں کو ناکام کر دیا! چچ چچ!" وہ خفت میں لب بھینچ کر بولا۔

یاسمین زور سے ہنس دی اور وہ خاموشی سے اس کے ہنستے چہرے کو دیکھنے لگا تھا۔ جب سیاہ آنکھیں، خوشیوں سے بھر جاتی تھیں، تو بہت خوبصورت دکھائی دیتیں۔

ہاں وہ اقرار کر رہا تھا۔ اسے وہ سیاہ آنکھیں خوبصورت لگی تھیں۔

"اگر آپ اجازت دیں تو بگھی بازار کی جانب لے کر جاسکتے ہیں؟ مجھے کچھ لینا ہے۔" وہ کچھ دیر بعد بولا۔

یاسمین نے اجازت دی تو بگھی بان نے بگھی بازار کی جانب دوڑائی۔

بازار پہنچ کر البرٹ بگھی سے اترا۔ ہاتھ میں ایک گملا لے کر وہ بگھی پر سوار ہوا۔

یاسمین ان پودوں کو متجسس ہو کر دیکھ رہی تھی۔

"یہ پودے؟" اس نے پوچھا۔

"یہ آپ کے لیے۔ اس دن آپ کے گھر کے باہر کیاری دیکھی تھی جس میں صرف وہ والے پھول تھے۔ کیا کہتے ہیں انہیں ہندی میں؟ ہاں یاسمین!"

یکدم یاسمین کی آنکھیں بے جان ہوئیں۔ کچھ دیر پہلے، چہرے پر جو نرمی حائل تھی، وہ سفاک تناؤ میں تبدیل ہو گئی تھی۔ البرٹ نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

"ان میں یہ لال گلاب بھی لگائیے گا۔ دونوں رنگ، سفید اور سُرخ خوبصورتی کا امتزاج پیدا کریں گے۔" وہ اپنی دھن میں کہہ رہا تھا۔

یاسمین اب بگھی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ البرٹ نے اسے مڑ کر جواب طلب نگاہوں سے دیکھا لیکن اس کی بے رونق آنکھیں ایک بار پھر دیکھ کر وہ مایوس ہو گیا۔ کون سی شے تھی جو بار بار ان آنکھوں کی رونق کھا جاتی تھی؟ وہ کون سی یادیں تھیں جو اسے اس قدر تکلیف بخشتی تھیں؟ کاش وہ جان سکتا۔۔۔ کاش!

بگھی یاسمین کی گلی میں رک گئی تھی۔ یاسمین اترنے لگی تھی۔

"یہ گلاب کے پودے لے جاتیں تو دل کو اچھا لگتا۔"

یاسمین کا انہیں اپنے ساتھ لے جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا لیکن ایک نظر البرٹ کی ان اصرار کرتی آنکھوں کو دیکھ لیا۔ اس نے اس خطا پر خود کو سرزنش کیا۔ کیا تھا کہ وہ ان اب انکار کر کے ان آنکھوں کو اذیت دینا نہیں چاہتی تھی۔ البرٹ کی دلکش آنکھیں صرف خوشیوں سے بھری اچھی لگتی تھیں۔

ہاں وہ اقرار کرتی تھی، اسے وہ شہد رنگ آنکھیں دلکش لگی تھیں۔

بنا کچھ بولے، اس نے وہ گملا ہاتھوں میں تھام لیا۔ یاسمین نے نیم بیدار سے عالم میں بٹوے میں ہاتھ ڈال کر سکے نکالے تب ہی اس کے ہاتھ کی پشت سے ایک کاغذ چپک گیا اور بگھی کے فرش پر جا گرا۔ البرٹ کی اب تک اس پر توجہ نہ گئی تھی۔

وہ اسے گلی میں قدم بڑھاتے خود سے دور جاتے دیکھ رہا تھا۔

آنکھوں میں افسوس تھا۔ آخر کیا ہو گی اس لڑکی کی کہانی جو اس کے اندر سے زندگی کی ہر رمق چٹ کر چکی تھی؟

اب کہ بگھی دوڑنے لگی تو اس نے سر جھٹک دیا۔ نظریں اس تہہ شدہ کاغذ سے جا ملیں۔

اس نے کاغذ اٹھا کر تہیں کھولنا شروع کیں۔

وہ جیسے جیسے اس کاغذ میں لکھے لفظوں کو پڑھتا، اس کی آنکھوں میں خوف پھیلتا جاتا۔ آخری سطر پڑھ کر اس نے کاغذ نیچے کیا۔ شہد رنگ آنکھوں میں پریشانی کا راج تھا۔ سفید پیشانی شکن آلود اور پسینے میں بھیگ چکی تھی۔

آج رات، البرٹ ونسٹن پر نیند حرام ہو چکی تھی۔

.....☆☆☆.....

صبح ہونے کی دیر تھی، اور البرٹ سائیکل پکڑ کر چمنِ گلاب پہنچ گیا۔ اس کی آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ رات بھر اس کی نیند بے ربط رہی ہے۔

وہ بیکری میں ادھر ادھر ٹہل کر یاسمین کا انتظار کرنے لگا۔

کچھ دیر میں یاسمین آئی تو وہ اس کی طرف لپکا۔ وہ اسے اس قدر پریشان دیکھ کر تاسف کا شکار ہوئی۔

"یہ سب کیا ہے یاسمین؟" وہ مدہم آواز میں کہہ کر عجلت میں اپنی جیب سے کچھ نکالنے لگا۔

یاسمین کے ماتھے پر تشویش کی لکیریں ابھریں۔ اس کا حواس باختہ حال دیکھ کر دل ڈوبنے لگا تھا۔

اس نے وہ کاغذ یاسمین کو تھمایا۔ یاسمین اس کاغذ کو دیکھتے ہی پر سکون ہو گئی۔ ماتھے پر پھیلی لکیر فنا ہوئی اور آنکھیں پر سکون اور شانت ہوئیں۔

"بالکل۔ امرتسر میں ایک اور احتجاج ہونے والا ہے۔ اور اس سلسلے میں آج مسلم کارکن چمنِ گلاب میں رات کے پہر جمع بھی ہوں گے۔" وہ اسے دیکھ کر سرد سانس خارج کرتے اطمینان سے بولی۔

البرٹ بے یقینی کے عالم میں گردن نفی میں ہلانے لگا۔

"یاسمین، خود کو اس طرح خطرے میں نہ جھونکیں۔ اگر ہندوستانی احتجاج کر رہے ہیں تو برٹش راج کا جبر بھی بہت سنگین ثابت ہو رہا ہے۔ میں روز خبریں پڑھتا ہوں، روز کسی نئے لیڈر کو وہ لوگ گرفتار کرتے ہیں۔ اپنی جان کو اس طرح خطرے میں نہ ڈالیں، یاسمین۔" وہ نرمی سے التجائیہ انداز میں کہنے لگا۔

یاسمین جامد رہ کر، اس کی شہد رنگ آنکھوں میں پھیلی اس خالص تشویش کو دیکھتی گئی۔

"بجا فرمایا۔ ان تمام خبروں سے ہم بھی آشنا ہیں۔" معمول کے برعکس، آج اس نے اپنا انداز نرم رکھا۔ وہ خالص نیت کے ساتھ اسے خبردار کر رہا تھا، وہ چاہ کر بھی کچھ کڑوا نہ کہہ سکی۔

"لیکن ہم پھر بھی ہم آہنگ ہو کر سڑکوں پر نکلیں گے۔ اپنے خلیفہ اور خلافت کے لیے یکجا ہوں گے۔ اور تمہیں کیا لگتا ہے کہ کیا یہ سب ہمارے لیے دشوار نہیں؟ یوں دھوپ میں اپنے وجود کو تپانا، گلیوں میں دوڑنا، اپنی بھوک پیاس کو بالائے طاق رکھ کر، گھٹتی ہمت اور توانائی کے ساتھ سمجھوتا کرنا۔ نہیں، یہ مراحل اذیت ناک ہیں۔ ہم سب بار بار اس عذاب سے خود کو گزارتے ہیں، البرٹ۔

تم خود سوچو کہ ہمیں کس قدر لاچار کر دیا گیا ہے، کس قدر مجبور کر دیا گیا ہے، ہمارے جذبات کے ساتھ کھیل کر ہمیں اس قدر زچ کر دیا گیا ہے کہ اب ہمیں موت، اس قید بھری زندگی سے زیادہ بہتر لگتی ہے، البرٹ! اب تم بتاؤ، کیا ہم غلط ہیں؟ کیا ہم اور باقی سب جو اس احتجاج میں حصہ لیں گے، کیا ہم غلط ہیں؟ کیا یہ ہمارا حق نہیں۔" وہ نرمی سے اسے قائل کرنے لگی

البرٹ کے چہرے پر پھیلیں تفکر کی لکیر ڈھیلی پڑی، البتہ آنکھوں کی بے چینی برقرار تھی۔

"مجھے ڈر لگتا ہے یاسمین۔" شہد رنگ آنکھیں نم ہوئی اور ان میں ایک آنسو پھوٹا۔ "مجھے بس ڈر لگتا ہے۔" وہ اسے دیکھتے بولا۔

یاسمین کا دل لرز اٹھا۔ دور اندر کہیں چبھن ہوئی۔ وہ کیوں اداس تھا؟ یہ اداسی باعثِ تکلیف کیوں بن رہی تھی؟ وہ ان سوالات کے جواب بوجھنے سے قاصر تھی۔ اس کے لیے اپنے چہرے کی سرد مہری برقرار رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔

"آپ ٹھیک کہتی ہیں کہ یہ آپ سب کا حق ہے۔ یہ جنگ آپ لوگوں کی ہے اور میں یہی چاہوں گا کہ آزادی آپ سب کا مقدر بنے۔ میں آپ اور آپ کے لوگوں کی سلامتی کے لیے دعا کروں گا۔ بس، اپنا خیال رکھیے گا۔" وہ اداس سا مسکرایا اور مڑ کر وہاں سے چلا گیا۔

یہ دوسری بار تھا، جب البرٹ ونسٹن نے چمنِ گلاب سے کچھ نہیں خریدا تھا۔

پہلی بار تو یاسمین مجاہد کو فرق نہ پڑا تھا۔ مگر آج، وہ اسے روکنا چاہتی تھی۔ اسے پیچھے سے پکارنا چاہتی تھی۔ اس کے خالی ہاتھ جانے سے اس کے دل میں گرانی کیوں محسوس ہوئی؟

اس پر سانس تک لینا گراں گزر رہا تھا۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ یادوں کے یلغار نے دماغ کو دھندلایا۔

"اپنا خیال رکھنا۔" ایک مانوس آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تو تو لگا جیسے کسی نے دل مٹھی میں جکڑ لیا ہو۔ زخم پھر سے کھرچ گئے تھے اور روح خون میں نہا گئی تھی۔ آخر کیوں۔ کیوں یہ زخم بار بار کھرچ دیے جاتے تھے؟

"یاسمین!" اونچی آواز کانوں سے ٹکرائی تو وہ گہرا سانس خارج کرتے بیدار ہوئی۔ گاہکوں کا رش لگ چکا تھا اور اس کے عقب میں ایک عورت کھڑی تھی۔

"کب سے آوازیں دے رہی ہوں۔ سب خیریت تو ہے۔"

اس نے چہرے پر وہی سرد مہری کا خول چڑھایا۔ اپنے ڈھیلے اعصاب کو پھر سے تناؤ سے دوچار کیا۔ لیکن اس سب کے باجود، دماغی خلفشار نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔

.....☆☆☆.....

جیا میں رات کا مصروف ترین پہر چل رہا تھا، اس لیے ہر طرف مردانہ قہقہے، خوش گپیاں سنائی دیں گی۔ البرٹ میز کے گرد بیٹھے، کھوئے کھوئے انداز میں گرما گرم چائے کے گھونٹ بھر رہا تھا۔ ہاں، آج چائے کچھ بے لذت محسوس ہو رہی تھی۔ نہ جانے کیوں؟

یکدم، اسے سامنے سے کرسی کھسکنے کی آواز آئی تو وہ بیدار ہوا۔ اس نے نظریں اٹھائیں۔ سامنے والی کرسی پر جیمس براجمان ہوا تھا۔ جیمس نے اپنے چہرے پر مسکان سجائی اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

البرٹ کے حلق میں کڑواہٹ گھل گئی۔ اس نے بمشکل، ناگواری کو اپنے چہرے پر آنے سے روکا۔ جیمس کی موجودگی میں وہ گھٹن محسوس کرتا تھا۔

"کیا حال ہے؟" جیمس نے اس کے اندر پنپتا اضطراب بھانپ تو لیا تھا لیکن فی الوقت اسے اس سب سے کوئی غرض نہ تھا۔ وہ تو خبر رساں تھا۔ خبر سنانے آیا تھا۔ ایک کھیل کو ترتیب دینے آیا تھا۔

"ٹھیک ہوں۔" انداز میں واضح کھچاؤ تھا۔

البرٹ نے مبہم انداز میں شانے اچکا دیے۔ آنکھوں میں خوشی سی پھوٹی۔ اس نے لب کھولے، یقیناً اس کے کلمات شر سے پاک نہ ہوں گے۔

"مسٹر رائٹر، آپ کو خبر ملی؟" مصنوعی خوشگوار مسکراہٹ کی فطرت میں تبدیلی آئی۔ وہ معنی خیز ہوئی۔

البرٹ کے دل کو کسی انجانے خدشے نے گھیرا تھا۔ اس نے بھنویں سکیڑیں۔ شہد رنگ آنکھوں میں پریشانی کی جھلک تھی۔

"کیسی خبر؟" بظاہر لہجہ پرسکون رکھا۔

"چمنِ گلاب۔" جیمس نے تضحیک سے تالی پیٹی اور زور سے ہنس دیا۔ آج وہ برائی کو چھپانے کی کوشش بھی نہ کر رہا تھا۔

چمنِ گلاب کا نام سن کر، شہد رنگ آنکھوں میں شاک کی آمیزش ہوئی۔ سفید ہاتھ مٹھی میں جکڑ گئے۔ اسے جیمس کی غلیظ زبان سے، وہ نام سن کر غصہ چڑھنے لگا تھا۔

"چمنِ گلاب کیا؟" آواز میں لڑکھڑاہٹ اور بے چینی تھی۔

"چمنِ گلاب میں آج ایک پرائیویٹ میٹنگ ہونے والی ہے جب کہ حکومت نے اس طرح کی گیدرنگز پر پابندی لگائی ہوئی ہے۔ معذرت کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے، لیکن تمہیں خاصہ بے وقوف بنایا گیا ہے۔"

البرٹ کرنٹ کھانے والے انداز میں کھڑا ہوا۔

اس نے آنکھوں میں وحشت لیے جیمس کو دیکھا۔ پیشانی پسینے میں تر ہوئی۔ سانسیں گہری ہونے لگیں۔

"کیا کہہ رہے ہو؟" آواز میں دبا دبا اشتعال تھا۔

جیمس نے مسکراہٹ سمیٹ کر البرٹ کے بدلتے انداز پر غور کیا۔ مقابل کھڑے اس شہد رنگ آنکھوں والے مرد کی پریشانی، چہرے پر پنپتی بے بسی، اور آنکھوں میں جھلکتا اشتعال، اسے محظوظ کر رہا تھا۔

"میں تو بس اطلاع دینے آیا تھا۔ ان لوگوں کو لگتا ہے کہ یہ چھپ سکتے ہیں جب کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔ نہ جانے کتنے احتجاج اسی کے کرائے گئے ہیں۔ حکومت کی خلاف ورزی کریں گے تو ہم بھی اسی مطابق خاطر تواضع کریں گے۔" وہ سینا تکبر سے پھلاتے بولا۔

لحظہ بھر شہد رنگ آنکھوں میں سکوت ابھرا۔ نگاہیں کچھ پر سوز ہوئیں اور پھر پر عزم جن میں خوف کی ہلکی سی رمق دیکھی جا سکتی تھی اور پھر وہ جیمس کی آنکھوں میں غصیلی نگاہ ڈالتے کھڑا ہوا۔

کچھ دیر وہ اس بھوری آنکھوں والے مرد کو سانسیں پھلا کر دیکھنے لگا۔ پھر درشت انداز میں اس کی طرف جھکتے اس کے سینے پر دستک دی۔

"اگر یاسمین کو کچھ بھی ہوا ناں، جیمس۔ تو امرتسر کی گلیاں تمھارے خون میں رنگ جائیں گے۔" وہ چبا چبا کر کسی شیر کی طرح غرایا۔

جیمس آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنے لگے۔ پل بھر میں آنکھوں کی حیرت فنا ہوئی اور وہ شر سے چمکیں۔ تو معاملہ اتنی سنجیدگی اختیار کر چکا تھا۔ وہ دل ہی دل میں ہنس دیا۔

جیمس کھڑا ہوا، جب کہ البرٹ مڑ کر جانے لگا۔

"آخر کیوں اس کی خاطر مرنے مارنے پر تلے ہو مسٹر البرٹ۔" انداز تپانے والا تھا۔

البرٹ کے قدم تھم گئے۔ وجود ساکت ہوا۔

"کیوں اس کے لیے اتنے بے چین ہو رہے ہو۔ آخر ایسا کیا ہے تم دونوں کے بیچ؟" لبوں پر عیار مسکراہٹ پھیلی۔

البرٹ کے چہرے پر پھیلا تناؤ ڈھیلا ہوا۔ ہاتھوں کی مٹھی کھل گئی۔

"جو ہمارے بیچ ہے، شاید اسے لفظوں میں بیاں نہیں کیا جا سکتا۔" آواز دھیمی تھی۔ دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ جسم سے گرمہ گرم شعائیں پھوٹ رہی تھیں۔

وہ مڑا۔

شہد رنگ آنکھیں سُرخ ہوئیں۔ ان میں پنپتی عقیدت کو دیکھ کر جیمس ایک بار پھر دنگ رہ گیا۔ معاملہ واقعی سنگین تھا۔

"سایہ ساتھ چھوڑ جاتا ہے، مگر یاسمین کا خیال میرے ذہن کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔" آنکھیں بھیگ گئیں۔

"میرے بس میں ہو تو میں ایک خول بن جاؤں اور ان کی زندگی بھر حفاظت کروں۔ ایسا کیوں ہے، کب سے ہے۔ میرے پاس جواب نہیں۔ مگر جو ہمارے درمیان ہے وہ اتنا خالص ہے کہ تمھارے جیسے کھوٹے انسان کو سمجھ نہیں آسکتا جیمس۔" اور اسی پل سُرخ انگارے کی مانند دہکتے رُخسار سے آنسو تیر تا زمین پر جا گرا۔

جیمس لاجواب ہو گیا۔ اس کی آواز میں جو خلوص وہ سن رہا تھا، اس نے اسے جھنجھوڑ بھی دیا تھا۔

البرٹ اسے ناگواری سے دیکھتے چلا گیا اور اب جیمس نے بھی اسے نہ پکارا۔

کچھ دیر جیمس کسی بت کی طرح کھڑا رہا۔ جیسے اب تک وہ البرٹ کے الفاظ کے حصار میں ہو۔

وہ سر جھٹکتے ہوش میں آیا۔ اور باہر جانے لگا۔

آخر کو تماشہ اسے اپنی آنکھوں سے جو دیکھنا تھا۔

کہا تھا نا، اس کے ارادے شیطانی تھے۔

.....☆☆☆.....

اور یہ تھی چمنِ گلاب کی حقیقت۔

وہ بے ضرر سی بیکری، انقلاب کا ایک نشان تھی۔

دن کے وقت جہاں لوازمات بیچے جاتے تھے، وہاں رات کے وقت امرتسر کے مسلمان اپنے اجلاس و احتجاج کے منصوبے بناتے تھے۔

چھپ کر۔ اپنی بغاوت کے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کی تیاریاں کرتے تھے۔

یہ تھی چمنِ گلاب۔ جو عدل کی اس انگیزش میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھی۔

اور کیا تمہیں یہ لگتا ہے کہ چمنِ گلاب اکیلی تھی؟

ہر گز نہیں۔ تمہیں ہندوستان بھر میں لاکھوں چمنِ گلاب نظر آئیں گی۔ تمہیں ہندوستان میں لاکھوں یاسمین مجاہد نظر آئیں گی۔

ان سب کے دلوں میں بس ایک ہی مہر ثبت تھی۔

انگیزشِ عدل کی مہر!

.....☆☆☆.....

وہ اپنی سائیکل سڑکوں پر بھگا رہا تھا۔ دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس کے پیچھے جیمس تھا، لیکن البرٹ اس کی موجودگی سے لاعلم تھا۔

اسے کسی بھی طرح سے پولیس سے قبل وہاں پہنچنا تھا اور یاسمین کو بچانا تھا۔

تاخیر کی قیمت بہت بھاری ثابت ہونی تھی۔

بہت بھاری!

.....☆☆☆.....

گول دائرے کی صورت کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ ان پر پانچ لوگ براجمان تھے۔ یہ سب جماعتوں کے لیڈرز تھے، آزادی اور خلافت کی عدم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والے مسلمان تھے۔

"تمام پوسٹرز بٹ گئے تھے، اکبر صاحب؟" یاسمین نے عمر رسیدہ اکبر کو مخاطب کیا۔

"ہاں یاسمین۔ پورے بازار میں تقسیم کر دیے گئے ہیں۔" انھوں نے سرد مہری سے جواب دیا۔

"یہ احتجاج اب تک کا سب سے پر زور احتجاج ہو گا۔ اگر انہیں لگتا ہے کہ جلیاں والا باغ کے بعد ہم سہم جائیں گے تو محض یہ گمان ہے۔" آواز میں غضب اتر آیا۔

کمرے میں موجود ایک ایک فرد نے گردنیں اوپر نیچے ہلائیں۔ ان کے چہرے فرطِ جذبات سے دہک رہے تھے۔

زرد روشنیوں میں نہائی بھوری دیواریں بھی اس لڑکی کو سن رہی تھیں۔

"ہم صدیوں سے اپنی زمین پر ان لوگوں کا قبضہ جھیل رہے ہیں۔" وہ بلند آواز بولی۔

"مگر اب۔ اب ہندوستان بھی آزادی دیکھے گا۔ ہم جانتے ہیں، ایک صبح ایسی بھی طلوع ہو گی جب ہم آزاد فضا میں سانس لیں گے۔ ہمارے دل سے ایک آواز آتی ہے، جو ہم سے کہتی ہے کہ ہندوستان جلد ہمارا ہو گا۔ ایک وقت آئے گا جب ہمارے لوگ جو چاہیں، کہہ سکیں گے۔ ہمارے لوگ اس ملک کا نظام چلائیں گے۔ ہمارے لوگوں کے پاس اقتدار ہو گا۔"

سب کے دلوں میں والہانہ پن تھا۔ آزادی کی اس خواہش، اس پیاس اور تڑپ نے ان کی آنکھوں کو نم کر دیا تھا۔

"کیا ہوا اگر ان کی جدید اسلحے سے آراستہ افواج سے لڑنے کے لیے ہمارے پاس برہنہ تلواریں تک نہیں؟ پر ہمارے پاس دو ہتھیار موجود ہیں!

ہماری آواز۔

اور خدا کی ذات پر غیر متزلزل یقین۔

اور یہ ایک ایسا ہتھیار ہے جو ان کی بندوقوں کو خاک میں ملا سکتا ہے۔ ہمیں ثابت قدم رہنا ہو گا۔ ہمیں ہماری ذات سے پہلے اپنے لوگوں کا سوچنا ہو گا، ہماری نسل کا سوچنا ہو گا۔ اگر آج ہم نے اقدام نہ اٹھائے تو ہماری نسل ان ہی مظالم کا شکار رہے گی۔ تو کیا ہمیں یہ منظور ہے؟"

اس نے کہہ کر سانس لینے کو وقفہ لیا اور سب کو دیکھا۔ سب نے سُرخ چہروں کو نفی میں ہلایا۔

"پھر نکالیں اپنی جماعتوں کو سڑکوں پر۔ اور نعرہ بلند کریں! جیے ہندوستان!" وہ بلند حوصلگی کے ساتھ بولی۔

"جیے ہندوستان!" اکبر نے جوابی نعرہ بلند کیا۔

"جے ہند!"

"انقلاب زندہ باد!"

عنقریب پورا چمنِ گلاب نعروں سے گونج اٹھا۔

دیواروں کو خبر ہو چکی تھی کہ یہ نعرے عنقریب معدوم ہو جائیں گے۔ وہ افتاد کی آمد سے باخبر تھیں، اس کے باوجود انھوں نے خاموشی اختیار کی۔

وہ چمنِ گلاب سے بغاوت کر گئی تھیں۔

.....☆☆☆.....

چرچرانے کی آواز کے ساتھ پولیس کی گاڑی، چمنِ گلاب کے باہر رک گئی۔

اندر سے چار پولیس افسر بر آمد ہوئے۔ ان میں سے ایک ولیم تھا۔ بلاشبہ وہ وقت پر پہنچے تھے۔

ان کے چہروں پر تکبر آمیز تناؤ حائل تھا۔ آج دنگا فساد کرنے والے ایک گروہ کو بے نقاب کرنے والے تھے، اس کی جڑیں کاٹنے والے تھے۔ یہ احساس ان کی انا کو ہوا دینے کے لیے کافی تھا۔

ولیم آگے بڑھا۔ محتاط انداز میں چلتے ہوئے اس نے اپنی گن نکالی، اور دروازے کی طرف تان لی۔

سب پولیس والوں نے اپنی گنز لوڈ کی ہوئی تھیں۔

دروازے پر کھٹکھٹاہٹ ہوئی۔

وہ سب ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ خوف وہراس ان کی آنکھوں پر سمایا ہوا تھا۔ چمنِ گلاب کی اس جوشیلی فضا میں، آہستہ آہستہ خاموش انتشار گھلنے لگا تھا۔

"پولیس نے تمہیں گھیر لیا ہے۔ اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر لو۔"

اب کی بار سب کے لب کھلے، حلق خشک ہونے لگے۔ وہ خبر موت کا پیغام دے رہی تھی۔

"یہ کیسے ہوا؟ ہماری میٹنگز کے بارے میں پولیس کو خبر کیسے ہوئے؟" ایک صاحب حیرت سے بولے۔

یاسمین کا دل ڈگمگایا۔ بھوری بھنویں ستائش سے سکڑ گئیں۔

"یا تو وہ لوگ ہمارے اوپر نظر رکھے ہوئے ہیں، یا پھر۔۔" جواب دیتے دیتے یاسمین کی رنگت فق ہوئی۔ سینے میں سانپ لوٹے۔ "یا پھر کسی نے ہمارے ساتھ دغا کیا ہے۔"

سب کے چہروں پر مزید پریشانی در آئی۔

"ہم دس تک گنیں گے۔ اگر تم لوگ باہر نہ آئے تو یہ دروازہ توڑ دیں گے۔" ولیم دھاڑا تو یاسمین کھڑی ہوئی۔

اس نے جلد از جلد کوئی فیصلہ لینا تھا۔

مشکل فیصلہ۔

"آپ سب کو روانہ ہونا ہو گا۔"

"ایک!" باہر سے آواز آئی۔

"ہم آپ کے بغیر کہیں نہیں جائیں گے، یاسمین۔" اکبر صاحب بولے۔ باقی سب نے سر اثبات میں ہلایا۔ یا تو سب ایک ساتھ پولیس کے حوالے ہوں گے، یا کوئی بھی نہیں۔ سب نے پُختہ ارادہ کیا۔

"آپ سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ہماری گرفتاری ضروری ہے۔"

"دو!"

"وہ یہاں پر صرف ہمارے نام سے واقف ہیں۔ ہمیں گرفتاری دینی ہو گی تاکہ ان کو یہ گمان ہو کہ ان کے ہاتھ کچھ تو لگ گیا ہے۔ آپ سب کو چھپنا ہو گا۔ ان احتجاج کو آگے آپ سب نے ہی بڑھانا ہے۔ کیا ہوا اگر چمن گلاب یہ مقصد سر انجام نہ دے۔ ایسی دس چمنِ گلاب ہم کھڑی کریں گے۔" وہ حتمی انداز میں بولی۔ وہ اپنے ارادوں پر پختہ تھی۔

سب ٹھنڈے پڑنے لگے۔ لیکن اپنی لیڈر کو اکیلے چھوڑ جانا ایک معیوب خیال تھا۔

"تین!"

"مگر یاسمین۔"

"مگر و گر کچھ نہیں۔ یہی ہمارا فیصلہ ہے۔" وہ دروازے کو تک رہی تھی۔

مگر وہ سب اسے تک رہے تھے۔

"چار!"

"پچھلے دروازے سے سب روانہ ہوں گے۔" گردن کرخت ہوئی۔ لہجہ پر تپش۔ "احتجاج ہر صورت ہوں گے۔"

سفاک و پر سوچ خاموشی۔

"پانچ!"

"اب دیر نہ کریں۔ ان لوگوں کو سامنہ کرنے کے لیے' ہم ہمیشہ سے خود کو تیار کر رہے تھے۔"

اس نے تحکم سے کہہ کر گردن مزید اکڑائی۔

سب کے چہروں پر آنسو تھے۔ آج وہ اسے قربانی دیتے دیکھ رہے تھے۔ کل کو قربانیاں انہیں بھی دینی تھی۔ تو کیا تمہیں واقعی لگا تھا کہ آزادی بنا قربانی کے حاصل کی جاسکتی ہے؟

"چھ۔"

یاسمین نے اب چمنِ گلاب کے دروازے کی طرف قدم بڑھانا شروع کیے۔ دل نے ڈبکی لگائی۔ کچھ چیزیں باتوں باتوں میں زیادہ آسان ہوتی ہیں، ان پر عمل پیرا ہونا، کانٹوں پر چلنے کے مترادف ہوتا ہے۔ اپنی قید تک چلنا بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

"سات!"

اس کا دل حلق میں آرہا تھا۔ وہ جانتی تھی یہاں سے زندگی ایک تکلیف دہ موڑ لینے والی تھی۔

وہ تیار تھی، ہمیشہ سے خود کو تیار کر رہی تھی۔ اسے لگا تھا کہ وہ بے خوف ہو گئی تھی' لیکن نہیں۔ وہ بے خوف نہیں تھی۔

"آٹھ!"

لیکن وہ خوف بے ضرر تھا۔

وہ ان تکالیف کے سامنے کوئی حیثیت نہ رکھتے تھا جو اس کے حریف نے اسے پہنچائی تھی۔

"نو!"

اس نے چہرا پر سکون رکھا۔

"کبھی اپنی گردن جھکنے نہ دینا، یاسمین۔" ایک مردانہ آواز اس کے ذہن میں چکر کاٹنے لگی۔

"دس۔" ولیم نے گن نیچی کی۔ وہ دروازے کی طرف بڑھنے ہی لگا تھا کہ دروازہ کھل گیا۔

سامنے یاسمین کا رعب دار با، وقار سراپہ تھا۔ آنکھیں بے خوف اور برفیلی تھیں۔

وہ ہر محاذ سے لڑنے کے لیے تیار تھی۔

.....☆☆☆.....

اس کی سائیکل چمنِ گلاب کے سامنے رکی۔

آنکھیں وہ منظر دیکھ رہی تھیں، مگر دماغ یقین کرنے سے انکار کر رہا تھا۔ دل جیسے سینے کی سرحدوں کو عبور کرنے کی ضد میں تھے۔

وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔

وہ ہتھکڑی سے بندھی ہوئی تھی' اور ولیم اسے گاڑی تک لے کر جا رہا تھا۔

البرٹ دم سادھے اسے دیکھ رہا تھا۔ آنکھیں شکستہ تھیں۔

اسے بہت دیر ہو گئی تھی۔ بہت دیر۔

"اندر باورچی خانے میں پرنٹنگ پریس بھی ملا ہے سر۔ یہ پامفلیٹس یہیں سے بنتے تھے۔" پیچھے سے پولیس والے نے صدا لگائی تو ولیم مسکرایا۔ مسکرا کر اس نے البرٹ کو دیکھا۔

البرٹ کو دیکھتے ہی مسکراہٹ معنی خیز ہوئی۔

"کیسے ہیں البرٹ صاحب۔"

البرٹ ششدر تھا۔ دماغ سن تھا، اس لیے وہ کچھ نہ بولا۔

"ہم آپ کے مشکور ہیں۔ جیمس کو سب درست وقت پر بتانے کے لیے تہِ دل سے شکریہ!"

اس جملے نے البرٹ کانوں میں گویا سور پھونک دیا۔ اس نے زوردار جھٹکا کھا کر یاسمین کو دیکھا۔

ان دونوں کی آنکھیں جا ملیں۔

البرٹ کی آنکھوں میں ناسمجھی تھی، شاک تھا، بے بسی تھی۔

جب کہ یاسمین کی آنکھوں میں صرف اور صرف نفرت تھی۔

البرٹ کو تاسف نے گھیر لیا۔ شہد رنگ آنکھوں میں کرب اترنے لگا۔

وہ اسے نفرت سے کیوں دیکھ رہی تھی؟ کیا واقعی اسے یقین آ گیا تھا؟ اس کے دل پر خنجر سے چلے۔

بس ایک الزام کافی تھا اس کے پورے کردار کو خراب کرنے کے لیے؟

بس ایک جملہ کافی تھا یاسمین کو سب کچھ بھلانے کے لیے؟

وہ اسے اذیت سے دیکھ رہا تھا۔ بلکہ، صرف دیکھ ہی نہیں رہا تھا، وہ اذیت میں تھا۔ اسے چوٹ لگی تھی۔

یاسمین کی آنکھوں میں غیظ و غضب ابھرا۔ سب درست کہتے تھے۔ یہ برٹش قابلِ بھروسہ نہیں تھے۔

البرٹ گردن نفی میں ہلانے لگا' جیسے کہنا چاہ رہا کو' اس نے کچھ نہیں کیا تھا۔ اس کی آنکھیں نم ہونے لگی تھیں۔ لیکن یاسمین کی آنکھیں اب بھی اسے ملامت کر رہی تھیں۔

وہ لاجواب ہی تو رہ گیا تھا۔ یاسمین کی وہ نگاہیں اس کا دل چھلنی کر رہی تھیں۔ اس کی روح کو گھائل کر رہی تھیں۔ وہ اسے کیسے بتائے کہ یہ سب جھوٹ تھا۔ لیکن کیا یاسمین اسے جانتی نہیں تھی جو اتنی جلدی اس کو اپنا دشمن تصور کر بیٹھی؟

شاید جیمس نے ٹھیک ہی کہا تھا، یہ لوگ اپنی ہر آفت کا الزام دوسروں کو ٹھہرانے کے عادی ہیں۔

"سب جھوٹ ہے۔" اس نے آخری کوشش کرنا چاہی۔ ایسے جیسے ہوا میں تیر چلایا ہو، جو کہ وہ جانتا تھا کہ نشانے پر نہیں لگنا۔

"ہم پر ایک آخری احسان کرنا، البرٹ۔"

انداز میں اپنے لیے اجنبیت سن کر البرٹ کا دل روند گیا۔

"ہمارے بٹوے سے گھر کی چابی نکال لو، اور ہماری الماری میں موجود صندوق ہم تک پہنچا دو۔" وہ گردن اکڑا کر بولی اور اپنا منہ پھیر لیا، جیسے اس سے گھن کھا رہی ہو، اس کی ذات سے گھن، اس کی شخصیت سے گھن۔

آنکھوں میں کاٹ لیے، وہ اسے دیکھتا گیا۔ ولیم اب یاسمین کو دور لے کر جا رہا تھا۔ وہ اب گاڑی مین براجمان تھی۔

اسی وقت جیمس نے البرٹ کے کندھے پر ہاتھ جمایا۔

البرٹ نے مڑ کر، اسے نم آنکھوں سے دیکھا۔ جیمس کو دیکھ کر اس کا سر ساتوے آسمان سے ٹکرایا۔ اس نے جیمس کو گریبان سے پکڑا اور دیوار سے لگایا۔ اسی وقت آس پاس پولیس والوں نے گن البرٹ کی جانب تان لی۔

جیمس کھسیانا سا ہو کر ہنسنے لگا پھر اپنے ساتھیوں کو ہاتھ سے اشارہ کرنے لگا۔

"نیچے کر لو گنز۔ ہمارا ہی بھائی ہے یہ۔ شاباش۔" وہ پر سکون ہو کر بولا۔ چہرے پر کمینی مسکراہٹ تھی۔

پولیس والوں نے جھجک کر گنز نیچی کیں۔

"کیوں کیا میرے ساتھ ایسا؟ کیوں اس کی نظروں میں مجھے گرایا؟" وہ دانت پیستے بولا۔

"تم اب تک نہیں سمجھے۔" اس کے برعکس، جیمس پر سکون تھا۔ "میں نے تو تمھاری مدد کی ہے البرٹ۔ میں یہ غفلت کا بلبلہ پھاڑ دینا چاہتا تھا۔ آخر وہ اتنی جلدی کیوں مان گئی کہ تم نے ہی بات باہر کی ہے؟ کبھی سوچا؟ کیونکہ

اس نے کبھی تمھارے اوپر دل سے بھروسہ کیا ہی نہیں تھا۔ میں تمھارا دشمن نہیں، دوست ہوں۔ میں نے تمہیں ایک بڑی غلطی کرنے سے بچالیا ہے۔" جیمس آخر میں مسکرایا۔

البرٹ نے اس کا گریبان چھوڑا۔ وہ ایک بار پھر سے شل ہو گیا تھا۔ آس پاس ہوا اسے بھاری محسوس ہونے لگی تھی۔ جیمس ٹھیک کہہ رہا تھا۔ کیا اتنے دن اسے دیکھنے کے بعد اس کے ارادوں پر شک کرنے کی گنجائش بنتی بھی تھی؟

اس کا دل کرچی کرچی ہو گیا تھا۔ اس نے واقعی ایک ہندوستانی میں ایک دوست تلاش کر کے بہت بڑی غلطی کی تھی۔ اور اس غلطی کا نتیجہ وہ تکلیف تھی جس سے وہ اس وقت گزر رہا تھا۔ اس کا دل جیسے کچل دیا گیا تھا۔

.....☆☆☆.....

وہ اس سنسان گلی میں چل رہا تھا۔

یا یوں کہا جائے کہ وہ اپنا وجود اس گلی میں گھسیٹ رہا تھا۔

لڑکھڑاہٹ زدہ چال، بھیگی ہوئی پلکیں اور شل کندھے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ وہاں کیوں آ گیا تھا۔ شاید واقعی وہ اس پر ایک آخری احسان کر دینا چاہتا تھا۔

گھر کے عین سامنے وہ رک گیا۔ اس چھوٹی سی کیاری نے اس کی نظریں کھینچیں۔

جس کیاری میں کبھی صرف یاسمین کے پھول ہوتے تھے' آج وہاں اس کے دیے گلاب بھی لگے ہوئے تھے۔

وہ اداس سا مسکرایا۔

اور کرب سے مسکرایا

اور پھر نہ مسکرایا۔

سر جھٹک کر وہ چلنے لگا اور اس گھر کی پر فسوں فضا میں داخل ہوا۔ اسے لگا جیسے اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اس کے دل میں متعدد کانٹے پیوست ہوئے تھے۔ آج اس گھر کی دیواریں بھی ماتم کر رہی تھیں۔ ان کی سسک وہ محسوس کر پا رہا تھا۔

کمرے کی کربناک فضا میں داخل ہو کر اس نے وہ الماری کھولی۔ سرد خاموشی چاروں اور پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے جھک کر تانبے کا صندوق باہر نکالا۔

لمحے بیتے۔ لالٹین میں بھڑکتے شعلے کی ہوا کے جھونکوں سے جنگ جاری تھی۔

اور اس زرد روشنی میں وہ اس صندوق کو گھورے جا رہا تھا۔ دل اس صندوق کو کھولنے کی خواہش ظاہر کر رہا تھا۔ بالآخر اس نے وہ کھول دیا۔

اندر خط ہی خط تھے۔

اس کی شہد رنگ آنکھوں میں ستائش ابھری۔

اس نے خط کھول کر پڑھنا شروع کیا۔

پہلی سطر پڑھی۔۔۔

آنکھیں اشک برسانے لگیں۔۔۔

دوسری سطر۔۔۔

دل چیخنے لگا۔۔۔

چوتھی سطر۔۔۔

وجود اذیت میں جھلس گیا۔۔۔

اور جوں وہ خط مکمل ہوا، البرٹ کی سانسیں پھول گئیں۔ جیسے وہ کوئی جنگ لڑ گیا ہو۔ اسے لگا، جیسے اس کے کندھے پہاڑوں کے بوجھ تلے کچل دیے گئے ہوں۔

ہاتھ کپکپا رہے تھے۔۔۔

دل بے اختیار تھا۔۔۔

مگر پھر بھی، وہ خود کو مزید خطوط پڑھنے سے نہ روک پایا۔

ایک کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا، اور اس نے سارے خطوط ہی پڑھ ڈالے۔

اب کی بار جو کرب اس کے دل کو گھیرے ہوئے تھا وہ جان لیوا ثابت ہو رہا تھا۔ اس کے اندر سے جینے کی خواہش مسخ کر رہا تھا۔ اس کی شہد رنگ آنکھوں کی رونق کا قتل کر چکا تھا۔

اس نے صندوق بند کیا تو جیسے وہ کسی وقت کے دروازے کو بند کر کے، حال میں لوٹ آیا۔

گرمہ گرم آنسو اس کی آنکھ کی سمت سے ابلنے لگے تھے اور اس صندوق کی سطح کو بھگو رہے تھے۔ وہ سسکیاں لے لے کر روتا گیا۔

وہ اپنے لیے نہیں رو رہا تھا۔ ان خطوط کو پڑھ کر تو وہ اپنی تکلیف بھلا بیٹھا تھا۔ وہ خطوط جس تکلیف کا تذکرہ کر رہے تھے، اس تکلیف کے سامنے اس کا کرب تو جیسے وجود ہی نہیں رکھتا تھا۔

وہ یاسمین کے لیے رو رہا تھا۔ وہ صرف خط نہیں تھے۔

وہ یاسمین کی پوری سوانح حیات تھے۔ وہ اس کے ماضی کی کربناک داستان اپنے اندر سمائے ہوئے تھے۔ آج پہلی مرتبہ اس نے یاسمین کو پہچانا تھا۔

آج البرٹ کو معلوم ہوا تھا کہ، سیدہ یاسمین مجاہد آخر کیا تھی۔

اس نے درست سوچا تھا، یاسمین کی آنکھوں میں اترنا کسی کانٹے دار کھائی میں اترنے سے کم نہ تھا۔

آج وہ اترا تھا۔

گہرائی میں۔۔۔ اندھیرے میں۔۔۔

اور وہ لہولہان ہو گیا تھا۔

مگر اتنی تکلیف؟

.....☆☆☆.....

تھانے پر صندوق چھوڑ کر وہ سرائے واپس پہنچا۔

شہد رنگ آنکھیں سُرخی مائل ہو رہی تھیں، اور وجود وزنی محسوس ہو رہا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ بستر پر بیٹھ گیا اور گردن موڑ کر کھڑکی سے باہر نظر آتے ہلال کو تکنے لگا۔ شہد رنگ آنکھوں میں چاند کا خوبصورت عکس انعکاس ہو رہا تھا۔ مگر وہ خود غمگین تھیں۔ آسمان میں گھلی اس چاندنی کے باوجود یہ رات اسے غیر معمولی طور پر تاریک لگ رہی تھی۔

وہ جو خود تاریکیوں میں چلا گیا تھا، شاید اس لیے۔

اس کے کندھے شل ہوئے اور وہ بستر پر لیٹ گیا۔ دل میں سوزش بڑھنے لگی، اور آنسو بہنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہ بہت رویا۔ کتنا وقت بیتا، اسے اندازہ نہ ہوا۔

قیام کے آخری ایام میں ہندوستان اسے بدل رہا تھا۔ شاید پہلی مرتبہ البرٹ نے ہندوستان کو دیکھا۔ نگاہوں سے چمک دمک کی پٹی اتر گئی تھی اور اب وہ ہندوستان کا اصل دیکھ رہا تھا۔

وہ ہندوستان جو برباد ہو رہا تھا۔

جس کی مٹی میں تازے خون کی ملاوٹ تھی۔

وہ اٹھ کر بیٹھا۔ چہرے پر آنسو جمے ہوئے تھے، چہرے کی خال انتہائی خشک محسوس ہو رہی تھی۔ مگر اسے پرواہ نہ رہی تھی۔

چاندنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ وہ سو کھ چکا تھا۔

اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور خود کو کھڑا کیا۔

میز پر کاغذ پھیلے ہوئے تھے۔ اس کا وفادار قلم بھی، کاغذ پر روانی سے چلنے کے لیے تیار تھا۔

اور البرٹ۔۔۔

وہ بھی لکھنے کے لیے تیار تھا۔

.....☆☆☆.....

وہ اس کال کوٹھری میں قید تھی۔ وہ پتھریلی فرش پر گھٹنوں کے بل بیٹھی تھی۔ اس سنسان فضا کی مانند، اس کا چہرہ بھی پر سکوت و ویران تھا۔ بال جو اکثر جوڑے میں بندھے ہوتے تھے، اب کہ چوٹی میں بندھے ہوئے تھے اور اس کے کمر میں جھول رہے تھے۔

اس کے سامنے تانبے کا وہ صندوق تھا۔ اسے دیکھ کر وہ مسکرائی۔

آنکھیں بے ساختہ نم ہوئیں۔ اس نے محبت سے اس صندوق پر ہاتھ پھیرا اور اس پر بنے نقش کو پوروں سے محسوس کیا۔ سیاہ آنکھوں میں محرومی جھلک رہی تھی۔ اس نے صندوق کھولا تو وہ خطوط نمایاں ہوئے۔

گندمی ہاتھ کپکپاہٹ کے ساتھ اس صندوق میں داخل ہوئے۔ بالآخر اس نے ب ایک خط نکالا۔ وہ ان خطوط کو پچھلے سالوں میں اتنی مرتبہ پڑھ چکی تھی کہ ہر کاغذ کے رنگ سے ہی جان جاتی تھی کہ اس میں کیا لکھا تھا۔

خط میں لکھا پیغام، اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔

"میری یاسمین۔

مجھے آخر کار بختیار چچا نے مسجد میں دیکھ لیا۔ میں ان کی نظروں میں آنے کے لیے ان کے برابر والی صف پر نماز پڑھتا تھا۔ اور آج اتنی حجتوں کے بعد' انھوں نے مجھ سے بات کی۔

پچھلے کئی دنوں سے وہ مجھے دیکھتے تھے تو مجھے ان کی آنکھوں میں چمک نظر آتی تھی۔ اب پتہ نہیں یہ سب سراب تھا یا واقعی وہ مجھے اچھا سمجھتے ہیں۔

میں بس ایسے ہی کوشش کرتے رہوں گا۔ اور جب مجھے لگے گا کہ میں ان کے دل میں گھر کر چکا ہوں تو تمھارے لیے رشتہ بھی بھیجوں گا۔ ہماری محبت کی کہانی بہت جلد اپنے خوش بخت اختتام کو پہنچے گی، یاسمین۔

ہمیشہ معطر رہنا۔

تمھارا اپنا،

جمال الدین۔"

لبوں پر آسودہ مسکراہٹ سجائے، اس نے خط کو اپنے سینے سے لگایا۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

ان خط میں اب تک جمال کی خوشبو رقم تھی۔

اس نے آنکھیں بند کیں۔ یوں احساس ہو رہا تھا جیسے جمال اسے مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔

.....☆☆☆.....

وہ کاغذ کے صفحے پر اپنا قلم چلا رہا تھا۔

"یہ چند صفحات لکھنا میرے لیے نہایت مشکل ہے۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ ان صفحات کو سیاہی سے بھرنے کے لیے مجھ سے یہ کتاب لکھوائی گئی ہے۔

یہ صفحات ان ہندوستانیوں کے نام ہیں، جو آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں۔ جن کو دنیا جنگلی, وحشی اور بیوقوف سمجھتی ہے۔ جن کو دنیا ایسے تصور کرتی ہے جیسے وہ ایک جانور ہوں جو بلا ضرورت اپنے آپ کو تکلیف پہنچا رہے ہو۔

کچھ دنوں پہلے تک میں بھی یہی گمان تھا۔

پھر کسی نے مجھے سے پوچھا کہ: "میں اس دیس میں کتنے سالوں سے رہ رہا ہوں؟"

اور بس۔ مجھے میرا جواب مل گیا۔ دنیا کے کسی کونے میں بیٹھ کر ان پر تنقید کرنا آسان ہے۔ اور یہ صرف اس لیے کیونکہ نہ ہم نے ان جیسی زندگی جی ہے اور نہ ہی ان کی کہانی سے واقف ہیں۔

لیکن اب میں ان لوگوں کی کہانی جان گیا ہوں۔ میں جان گیا ہوں کہ یہ لوگ شدت پسند کیوں بن گئے ہیں۔ اب میں سب جان گیا ہوں۔

کہتے ہیں آگہی نعمت ہے۔ واقعی ایک نعمت ہی تو ہے۔ کیونکہ آگہی غلط فہمی کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ لیکن آگہی تکلیف دہ بھی ہوتی ہے۔

کچھ سچ اس قدر تکلیف دہ ہوتے ہیں کہ وہ آپ کو ساری زندگی ڈراتے ہیں۔ میرا بھی اس وقت کچھ ایسا ہی عالم ہے۔"

.....☆☆☆.....

کپکپاتے ہاتھ اور لرزتے لبوں کے ساتھ اس نے وہ خط واپس اس صندوق میں رکھا۔

اس نے دوسرا خط نکالا اور کچھ دیر اسے اپنائیت سے دیکھا۔

پھر اسے کھول کر اس میں لکھا پیغام پڑھا۔

"میری یاسمین۔

امید کرتا ہوں چھمی نے یاسمین کے بیجوں کے ساتھ، یہ خط بھی دے دیا ہو گا۔ اب ان یاسمین کے بیجوں کو اپنی کیاری میں لازماً لگانا۔ پتہ ہے مجھے کسی نے کہا تھا کہ یہ پھول بلا کے معطر ہوتے ہیں۔ اور پھر مجھے سمجھ آگیا کہ بختیار چچا نے تمھارا نام یاسمین کیوں رکھا۔

تو تم ان بیجوں کو اپنی کیاری میں لگانا۔ اس کیاری میں یاسمین کے پھولوں کا ایک چھوٹا سا چمن بنانا۔ انہیں دیکھ کر مجھے یاد کرنا۔ یہ میرا پہلا تحفہ ہے تمھاری لیے۔ ہماری محبت کی پہلی نشانی۔ وہ کیاری مانو کے تمھارا دل ہے، اور ان میں لگے یاسمین، میری محبت۔ تو اس کیاری کو ان پھولوں سے بھر دینا۔

اب اپنی معطر یاسمین کو ایک اور خوش خبری سناؤں؟ میں نے گھر میں بات کر لی ہے۔ اور ماں جان تیار ہیں جانے کے لیے۔ انھوں نے ایک خدشہ ظاہر کیا کہ تم لوگوں کی اتنی زمینیں ہیں۔ تمھاری دادی کی مشہور بیکری چمنِ گلاب بھی ہے۔ اور میں معمولی سا ایک سیپائی۔ لیکن چچا مجھے مادہ پرست نہیں لگے اس لیے دل مطمئن ہے۔

پھر بس۔ وہ دن بھی بہت قریب ہے جب تم میرے گھر میں، میرے کمرے میں میری بیوی بن کر آؤ گی۔

اور اب یہ راتیں میں اسی دن کے انتظار میں کاٹ دوں گا۔

اپنا خیال رکھنا یاسمین۔

وہ جو صرف اور صرف تمھارا ہے۔

جمال الدین"

.....☆☆☆.....

"میں آپ کو ایک لڑکی کی حقیقی کہانی سناتا ہوں۔

وہ جو شوخ و چنچل، خوش اخلاق تھی۔ اپنی دنیا میں مست، رنگوں میں رنگی ہوئی۔

اسے محبت ہوئی۔ اس محبت کو اس نے حاصل بھی کر لیا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کی محبت کا مل جانا اس کا خوش بخت انجام ہے۔ لیکن نہیں۔ اس محبت نے اس کی سب سے بڑی آزمائش بن جانا تھا۔ اس محبت نے اس سے ایسا کڑا امتحان لینا تھا، کہ اس نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بدل جانا تھا۔

آخر ایسا کیا ہوا؟ میں بتاتا ہوں۔"

.....☆☆☆.....

وہ اب تیسرا خط اٹھا رہی تھی۔ اس خط کی سطح پر ہاتھ رکھتے ہی اس کا دل بھر گیا تھا اور وہ رونے لگی تھی۔ اس خط پر لکھے الفاظ بہت بھاری تھے۔ کیونکہ وہ جمال کا آخری خط تھا۔

اس نے جیسے ہی اس خط کو اٹھایا اس کا دماغ اس کال کوٹھری سے پرواز کرنے لگا۔ وہ ماضی کے مناظر میں جانے لگی تھی۔

سامنے سے وہ دیواریں سرکیں۔

فرش ناپید۔

اور اس نے خود کو ایک گھر کے دروازے پر پایا۔

وہ چھے سال پہلے منظر تھا۔ اس کے سامنے جمال کھڑا تھا۔ سیاہ آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔

"نہ جائیں جمال۔" اس کا دل ہچکولے مار رہا تھا۔

اس نے نظر اٹھا کر، اپنے مقابل کھڑے اس خوبرو مرد کو دیکھا۔ اس کی بھوری آنکھیں شجاعت سے بھرپور تھیں۔ اسے دیکھتے ہی سیاہ آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

جمال نے اسے محبت سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر پھیلی نمی نرمی سے رگڑی۔ اس نے اپنے ہاتھوں کا پیالہ بنا کر، یاسمین کے خوبصورت چہرے کو تھاما۔

"ایسے نہ رو۔ میں جلد واپس آؤں گا۔ انھوں نے کہا تھا کہ اگر ہم اس جنگ میں حصہ لیں گے تو خلیفہ اور خلافت کو کچھ نہیں ہو گا۔" وہ عقیدت سے بولا۔

وہ گردن دائیں بائیں ہلانے لگی۔ دل کسی صورت مطمئن نہ ہو رہا تھا۔ وہ انہونی کو بھانپ چکا تھا۔

"مگر ہمارا دل ڈوب رہا ہے۔" اس کی گردن بے ساختہ، جھک گئی۔

جمال نے ایک مرتبہ پھر اس کے گالوں کو تھاما اور اس کی گردن اٹھائی۔

اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑھ کر بات جاری رکھی۔

"کبھی اپنی گردن جھکنے نہ دینا، یاسمین۔"

اس کے کہنے کی دیر تھی کہ یاسمین اس کے سینے سے لگ گئی۔

"بس اپنا خیال رکھنا اور دعاؤں میں یاد رکھنا۔"

ایک جھٹکا کھا کر وہ حال میں واپس آئی تھی۔

اس نے تکلیف دہ سسک لی جیسے وجود پر ایک خنجر پیوست ہوا ہو۔

آنسو اب تسلسل کے ساتھ روانہ ہو گئے تھے۔

وہ اس دن سنگاپور کے لیے روانہ ہوا تھا۔ اور پھر کبھی نہ آیا۔

کبھی نہیں!

.....☆☆☆.....

"جب انیس سو چودا میں عظیم جنگ کا آغاز ہوا اور برطانیہ نے جرمنی کے خلاف جنگ کا علان کیا تو ہندوستان کے مسلمان ڈر گئے تھے۔ مسلم سیپائیز نے عظیم جنگ میں حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ سلطنت عثمانیہ جرمنی کے ساتھ تھی۔

برٹش نے سیپائیز کو یقین دہانی کروائی کہ اگر وہ لوگ ان کی مدد کریں گے تو سلطنتِ عثمانیہ کو توڑا نہیں جائے گا۔

مسلم سیپائیز صرف اس باعث جنگ میں شریک ہوئے۔

اس لڑکی کا شوہر بھی ایک سیپائی تھا۔ وہ بھی یہی سوچ کر اس جنگ میں گیا تھا کہ ایسا کرتے ہوئے وہ سلطنتِ عثمانہ کو بچائے گا۔

لیکن سب کچھ دھرا کا دھرا رہ گیا جب میرے اپنے ملک کے حکمرانوں نے، ان کے ارمانوں کا خون کیا۔ انہیں ترکی میں لڑنے پر مجبور کیا۔ اس صورت میں جن سیپائیز نے لڑنے سے انکار کیا، انہیں بے دردی سے مارا گیا اور کچھ کو قید کر لیا گیا۔

قصوروار کون ہے؟ زخم کس نے کس کو دیا ہے؟ ظالم کون ہے اور مظلوم کون ہے؟

کیوں ہندوستانیوں کے جذبات کا اس طرح مذاق بنایا گیا تھا؟

اس لڑکی کا کیا قصور تھا کہ اس کی محبت ایک جھٹکے میں چھین لی گئی؟ کیوں اس کے رنگین خوابوں کو توڑا گیا؟

اور آج اگر وہ لڑکی اپنے حق کے لیے آواز اٹھانا چاہ رہی ہے تو کیوں اس کی آواز کو دبایا جا رہا ہے؟

ہندوستانی واقعی قید ہیں۔ انہیں نہ بولنے کی آزادی ہے نہ ہی اپنا حق مانگنے کی آزادی ہے۔"

.....☆☆☆.....

اس نے وہ خط کھولا۔ بوجھل دل کے ساتھ اسے پڑھنا شروع کیا۔

"میری یاسمین۔

میں جانتا ہوں یہ خط دیکھتے ہی تمھاری آنکھیں بھر گئی ہوں گی۔ میں جانتا ہوں تم رو رہی ہو گی۔ تکلیف میں ہو گی کرب میں ہو گی۔ یہی وجہ تھی کہ یہ خط لکھنے سے کترا رہا تھا۔ لیکن پھر تمھارا خیال آ گیا تو بہت مشکلوں سے یہ خط تمہیں بھیجنے کی سعی کی۔

یاسمین۔ یہاں حالات بگڑ گئے ہیں۔ افوائیں پھیل گئی ہیں کہ سنگاپور بلا کر وہ ہمیں ہانک کانگ نہیں ترکی بھیجنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ دعا کرو ایسا نہ ہو۔ بس دعا کرو۔ کیونکہ ہم کبھی بھی اپنے ترک بھائیوں سے نہیں لڑ سکتے۔ اگر یہ افوائیں سچ ہو جاتی ہیں یاسمین، تو بد قسمتی کے ساتھ ہمیں ان کے احکام ماننے سے انکار کرنا ہو گا۔

میں نہیں جانتا کہ اس کا انجام کیا ہو گا۔ لیکن یاسمین۔ یہ میری آزمائش ہے۔ میں چاہوں تو ان کی رضامندی میں راضی ہو کر ترکی چلا جاؤں۔ لیکن پھر اپنے اللہ کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ کیا جواب دوں گا؟

یاسمین۔ تم اپنے آپ کو مضبوط کر لو۔ یہ میری آزمائش ہے اور میری اس آزمائش کے اختتام میں تمھاری آزمائش شروع ہو گی۔ تم نے ہر چیز کے لیے تیار رہنا ہے۔ ہم ان برٹش پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ یہ ہمارے اوپر ہر صورت وار کریں گے۔ یہ ہمارے درمیان ایک زہر کی مانند ہیں۔ ایک سانپ کی طرح ہمارے دیس میں بیٹھے ہیں، یاسمین۔ میں رہوں نہ رہوں، اس سے فرق نہیں پڑتا، لیکن تم نے بھی وہی کرنا ہے جو میں کروں گا۔

وہ ہے جنگ۔ ہمیں اپنی آزادی کے لیے جدوجہد کرنی ہو گی۔ ہم ان لوگوں کو اپنے آپ پر مزید مظالم ڈھانے کی اجازت نہیں دے سکتے۔

اور خدارا رونا مت۔ تمھاری بھیگی آنکھوں اور غمگین چہرے کو تصور کرتا ہوں دل کرب سے جھلس جاتا ہے۔

میرے دور ہونے سے ہماری محبت میں فرق تھوڑی پڑے گا؟ تمہیں میں جب بھی یاد آؤں تو ہمارے اس چھوٹے سے یاسمین کے چمن کو دیکھ لینا۔ میرے پہلے تحفے کو یاد کرنا اور بس مجھے دعا دینا۔

وہ پھول تمہیں یاد دلائیں گے کہ تمہیں معطر رہنا ہے۔

اپنی زندگی کو پر مقصد بنانا ہے۔

اپنا خیال رکھنا۔

پھر ملیں گے،

فقط ایک دوسرے جہاں میں۔"

.....☆☆☆.....

"آج وہ لڑکی بدل گئی ہے۔ تہس نہس ہو گئی ہے۔

جو کبھی ہنستی تھی وہ اب ہنستی نہیں۔

جو کبھی مسکراتی تھی وہ مسکراتی نہیں۔

کون ہے اس کا مجرم؟

اور یہی تو کہانی ہر دوسرے ہندوستانی کی ہے۔ انھوں نے بہت کچھ گنوایا ہے۔ اپنے جذبات اور احساسات کی بے عزتی اور ناقدری سہی ہے۔

انہیں حق ہے اپنی آزادی کے لیے لڑنے کا۔

میں البرٹ ونسٹن، برطانیہ کا ایک شہری ہوں۔

اور میں ان ہندوستانیوں کے ساتھ ہوں۔

میں دعا گو ہوں کہ ایک دن ایسا بھی ضرور آئے۔ جب یہ لوگ آزادی دیکھیں۔

جب یہ لوگ حقیقت میں آزاد ہوں۔

میں چاہتا ہوں کہ ایک دن ان کی یہ کوششیں رنگ لائیں، اور رنگوں کا یہ دیس ایک بار پھر رنگین ہو جائے۔

میں البرٹ ونسٹن ہوں۔ اور میں ہر دلیر ہندوستانی کے ساتھ ہوں۔

ختم شد۔"

اس نے کاغذ سے قلم اٹھایا تو اس کی سانس پھولنے لگی تھی۔ دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔

اس نے قلم ڈھیلا چھوڑا اور اپنی گردن جھکالی۔ ایک گہری سانس اس کی ناک سے خارج ہوئی۔

اس نے اپنی گردن اٹھائی۔ ہلال کی چاندنی میں اس کا چہرہ نمایاں ہوا۔ سفید چہرہ سُرخی مائل تھا، اور آنکھیں دل میں بھڑکتی آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں آچکی تھیں۔

ایک جنگ اب اسے بھی لڑنی تھی۔

اور وہ تیار تھا۔

.....☆☆☆.....

آفتاب کی پہلی کرن نے امرتسر کے سیاہ آسمان کو چیر دیا۔ شب خوابی سے باشندے بیدار ہونے لگے اور رفتہ رفتہ بازار آباد ہوئے۔ مگر آج امرتسر بے رونق تھا، یوں جیسے اس کے احاطوں پر رنجیدگی کا بسیرا ہو۔

وہ اس گلی میں چل رہا تھا۔ آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے اور گالوں میں پڑتے گڈے اس کے ناتواں ہونے کی گواہی دے رہے تھے۔ وہ رات کے لباس میں موجود تھا۔ بلاشبہ، گزشتہ رات اس نے صبح کے انتظار میں گزاری تھی۔

قلتِ توانائی کے باعث، اس کی گردن جھکی ہوئی تھی اور وہ نڈھال ہونے کو تھا۔ ایک ایک قدم اٹھانا اس پر دشوار تھا، مگر پھر بھی وہ ہمت کی رسی کو مضبوطی سے تھام کر اس گلی میں اپنا راستہ بنا رہا تھا۔

وہ آج رکنے والا نہ تھا۔

آج معاملہ یاسمین کا جو تھا۔

وہ جو نہ جانے کیسے اس کی زندگی کا اتنا بڑا حصہ بن گئی تھی۔ اس سوال کے جواب کا تو وہ خود بھی متلاشی تھا۔

چمنِ گلاب کے عین سامنے اس کے قدم رک گئے۔ اس نے گردن اٹھا کر وہ تختی دیکھی جس پر چمنِ گلاب لکھا تھا۔ وہ مسکرایا، شہد رنگ آنکھوں کے پیچھے یادوں کی ٹرین چل پڑی۔ چمن گلاب، جہاں خوشیاں بانٹی جاتی تھیں۔

اس کی نظر اس تختی کے پیچھے پڑی۔ آج چمنِ گلاب کا دروازہ بند تھا۔ چہرے پر پھیلی مغموم مسکراہٹ کا خون ہوا۔ خوشگوار یادوں کی ٹرین پٹڑی سے پھسل گئی۔

وہ گلی کے بیچ میں کھڑے ہو کر اس دروازے کو ہنوز تکتا گیا۔ اس کے گرد و نواح میں لوگ چہل قدمی کر رہے تھے، سب کی اپنی اپنی مصروفیات تھیں۔ وہ کون تھا، کس حال میں تھا، کسی کو غرض نہ تھا۔

کوئی اسے جانتا نہ تھا۔

مگر اب سب اسے جان جائیں گے۔

دفعتاً اس نے کندھے اٹھائے۔ ہاتھوں کی مٹھی بنائی اور بازو ہوا میں بلند کیے۔

"کوئی مجھے سن رہا ہے!" وہ بلند آواز میں بولا۔

یکبارگی، سکوت سا بازار میں پھیلتا گیا۔ قدموں کی چاپ رک گئی، چہ مگوئیاں معدوم ہوتی گئیں۔

سب اپنی مصروفیات کے پندوں کو پسِ پشت دھکیل کر اس نقاہت زدہ مرد کی جانب متوجہ تھے۔

.....☆☆☆.....

وہ کال کوٹھری میں گھٹنوں کے بل بیٹھی تھی۔ اس کی پشت پر خواتین کا عملہ کھڑا تھا۔ سب کے چہروں پر اس لڑکی کے لیے شدید ناگواری تھی۔

ایک عورت نے کوڑا اس کی پشت پر برسایا۔ اس کے چہرے پر کرب جھلکا لیکن اس نے جسم کو حرکت کرنے سے باز رکھا۔ اس نے ہنوز اپنی گردن اکڑائی رکھی۔

آنکھوں کی سرد مہری کو برقرار رکھتے بس ایک جملہ اس کے ذہن میں گردش کر رہا تھا۔

"کبھی اپنی گردن جھکنے نہ دینا، یاسمین۔" کون جانتا تھا کہ جمال کی آخری ہدایتوں پر عمل کرنا اس قدر دشوار ہو جائے گا؟

("تم لوگ یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟ کوئی سیدہ یاسمین مجاہد کے لیے کھڑا کیوں نہیں ہو رہا؟" وہ بچی کچی ساری قوت بولنے میں خرچ کر رہا تھا۔)

"کہاں ہیں تمھارے باقی ساتھی۔" کوڑا برساتی عورت چبا چبا کر بولی۔ اس کی آنکھوں میں جارحانہ تاثر تھا۔

وہ جواب دے سکتی تھی، اسی وقت اس تکلیف سے نجات پا سکتی تھی۔ اس کے پاس وہ راستہ موجود تھا۔ دل کا ایک حصہ، شاید یہ کرنا بھی چاہ رہا تھا۔ مگر وہ اپنے لوگوں کو دھوکہ نہیں دے سکتی تھی۔ اس نے گردن کا تناؤ برقرار رکھا اور کوئی جواب نہ دیا۔

جواب نہ آنے کی صورت میں اس نے ایک اور کوڑا برسایا۔ اس کے حلق سے ایک سسکی نکلی۔ جسم میں تکلیف کی ایک لہر دوڑی۔

وہ موت کو چن سکتی تھی، لیکن اپنے حریفوں کے سامنے جھک جانا اسے گوارا نہ تھا۔

("تم اس کی عظمت کی داستان بھول تو نہیں گئے۔ کیا تم لوگوں کو یاد نہیں، کہ کیسے وہ تمھارے بچوں کو بسکٹس اور کیک دیتی تھی۔ یہاں کے بیوہ اور یتیم بہنوں کو، جن کے سروں پر وارث نہیں، انہیں امداد فراہم کرتی تھی۔ کیا تم لوگ یاسمین کے لیے آواز بلند نہیں کرو گے؟" آواز میں بلند حوصلگی تھی۔ ایک تاثیر تھی اس کی آواز میں جس کے باعث بازار میں کھڑے ہر شخص کی گردن جھک گئی تھی۔)

عورتوں کا عملہ اب اس کی خاموشی سے اکتا چکا تھا۔ سب نے ہاری ہوئی نگاہوں کا تبادلہ کیا۔ کچھ نامحسوس انداز میں پیر پٹختے، اور کچھ سر جھٹکتے وہاں سے چلی گئیں۔

ان کے جاتے ہی وہ ڈھیلی ہو کر فرش پر لیٹ گئی۔ سفید کرتے کی پشت، خون کی سُرخی میں رنگ چکی تھی، مگر اس نے چہرے پر ایک آنسو بھی پھوٹنے نہ دیا۔

اسے اپنے گھائل بدن کی پرواہ نہ تھی۔

کیونکہ وہ بے خوف تھی۔

("وہ جو تم لوگوں کے لیے آواز بلند کرتی تھی، آج اس کا حق نہیں کہ اس کے لیے آواز بلند کی جائے؟ کیا ہم ایسے ہی خاموش رہ کر اسے قید میں مظالم سہنے کی اجازت دیتے رہیں گے۔ خدارا جاگ جاؤ۔ چھوڑو اپنی آرام گاہیں اور نکل آؤ۔ جاگ جاؤ!")

امرتسر کے گلی کوچوں میں رش بھر گیا تھا۔

"یاسمین کو آزاد کرو" یہ نعرہ وہ سب بلند کر رہے تھے۔

اس احتجاج میں نہ صرف مرد شامل تھے، بلکہ عورتیں بھی شامل تھیں۔ وہ سب بھی شامل تھے جنھیں وہ اپنی بہن کہتی تھی۔ وہ بچے بھی شامل تھے جن کے سروں پر وہ شفقت سے ہاتھ پھیرتی تھی۔

("جاگ جاؤ۔ اسے ضرورت ہے ہماری!" وہ کہہ کر گھٹنوں کے بل زمین پر گر گیا۔ اشک اس کی شہد رنگ آنکھ سے ٹوٹ گیا۔

جوں اسے محسوس ہوا کہ کسی نے اس کی پشت پر ہاتھ رکھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔

"چلو!" ایک مرد اونچی آواز میں کہا۔

اس نے ادھر ادھر گردن دوڑائی۔ سب لوگ تیار تھے۔ سب کے چہرے اولوالعزم تھے۔ وہ سب بھی بے خوف ہو گئے تھے۔)

امر تسر کے بازار خالی ہونے لگے۔ یہاں تک ہندو کالونی سے بھی بچے عورتیں اور مرد یاسمین کے لیے نکلے تھے۔ سب مذہبی تفریق بھلا چکے تھے، کیونکہ یاسمین نے بھی کبھی کسی کے ساتھ بھلائی کرتے مذہب نہ دیکھا تھا۔

وہ ہم آواز ہو کر، حق کا نعرے امر تسر کی گلیوں میں بلند کر رہے تھے۔ اور ان کی منزل تھی پولیس اسٹیشن جہاں اسے قید کیا گیا تھا۔

گھنٹے بعد پولیس اسٹیشن کے باہر کا منظر بالکل بدل گیا۔ خالی سڑک سُرخ انگارہ چہرے اور پھولی چھاتیوں والے ہندوستانیوں سے بھر گئی تھی۔

انہیں بھاری تعداد میں دیکھ کر، ایسا گمان ہوتا تھا جیسا پورا امر تسر اپنی رہائش گاہوں سے نکل آیا ہو۔

ان مختلف قد و قدامت، مذاہب اور رنگوں کے لوگوں میں بس ایک چیز مشترکہ تھی۔ اور وہ تھا وعدہِ وفا!

پولیس اسٹیشن کے سامنے وہ ڈیرہ ڈال کر بیٹھ گئے۔ پہلی صف میں البرٹ ونسٹن بیٹھا ہوا تھا۔

کوئی طاقت اب ان کو اپنا حق لینے سے روک نہیں سکتی تھی۔

.....☆☆☆.....

وہ بدحواس عالم میں اس پتھریلے فرش پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس پر غنودگی طاری ہونے ہی لگی تھی کہ باہر سے آتی آوازوں نے اسے بیدار کیا۔

"سر اب ہم کیا کریں۔ پورا شہر اس کے لیے جمع ہو گیا ہے۔ وہ تعداد میں بہت زیادہ ہیں۔ اگر خدانہ خواستہ پولیس اسٹیشن میں داخل ہو گئے تو ہم سب مارے جائیں گے۔" جو آواز اسے سنائی دے رہی تھی اس میں پریشانی تھی۔

اس نے گردن اٹھائی۔ اس نے اپنے لوگوں پر فخر محسوس کیا تھا۔ وہ یہاں تنہا نہیں تھی، اس کے لوگ اس کے ساتھ کھڑے تھے۔ ہر کرب کے باوجود وہ آسودگی سے مسکرائی۔

"تو دوسرے شہروں سے مابز بلواؤ۔ ان کو یہاں سے جلد از جلد نکالنا ہو گا۔"

سیاہ آنکھوں میں پریشانی کے بازش لرزش پیدہ ہوئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھی۔ وہ مضطرب ہونے لگی۔

"سر ہم ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ۔" آواز میں ہچکچاہٹ تھی۔

"کیوں؟" آواز برہم تھی۔

"کیونکہ ان احتجاجیوں میں البرٹ ونسٹن بھی شامل ہے۔ اسی نے یہ احتجاج شروع کروایا ہے اور ہم اس کی جان خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔"

نام سن کر سیاہ آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔ کندھے شل ہوئے اور بھنویں اٹھ گئیں۔

البرٹ؟ وہ زیر لب بڑبڑائی۔

آنکھوں کے سامنے گزشتہ رات کا منظر چل پڑا۔

وہ اس کے سامنے کھڑا تھا، مگر وہ اسے نفرت سے دیکھ رہی تھی۔ اس وقت اس نے اس کی شہد رنگ آنکھوں کو نظر انداز کیا تھا، جو اس سے چلا چلا کر کہہ رہی تھیں کہ وہ بے قصور تھا۔ یہ الزام ایک گڑھے ہوئے جھوٹ سے زیادہ کچھ نہ تھا۔

"یہ سب جھوٹ ہے۔" البرٹ کی کرب میں جھلستی آواز اسے یاد آئی۔

وہ اسے غلط سمجھی۔ اس سے خطا ہوئی تھی۔

احساسِ ندامت نے اسے گھیر لیا تو اس نے اپنی آنکھیں میچ لیں۔ اس کی حقارت اور نفرت سے بھرپور نظروں نے نہ جانے اسے کتنی تکلیف دی ہو گی؟ وہ رات اس نے کیسے گزاری ہو گی، یہ جان کر کہ وہ پچھلا کیا سب بھلا گئی تھی اور ایک من گھڑت بات پر اس سے گھن کھانے لگی تھی۔

اس نے گردن اٹھا کر چھت کو دیکھا۔

کوئی اتنا احمق کیسے ہو سکتا ہے؟ سوچ کر سر جھٹکا، اور پھر سے آنکھیں بند کر لیں۔

.....☆☆☆.....

پانچ دن بعد۔۔۔

لوئیس سربراہی کرسی پر براجمان، چکنی پیشانی پر بل لیے ایک پرچہ پڑھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں سے صاف ظاہر تھا کہ باہر بیٹھے احتجاجیوں سے وہ اکتا چکے تھے۔ ان کے سامنے جیمس کھڑا تھا، جس کی بھوری آنکھیں الجھن میں مبتلا تھیں۔

کاغذ پڑھ کر انھوں نے اسے مٹھی میں جکڑ لیا۔ آنکھوں میں طیش ابھرا، جسے وہ مہارت سے چھپا گئے۔

"آرڈرز آ گئے ہیں۔ ہمیں اسے چھوڑنا ہو گا۔" انھوں نے میکانکی انداز میں کہا تو جیمس کی بھنویں اٹھ گئیں۔ وہ بے یقینی کے عالم میں گردن نفی میں ہلانے لگا۔

"آپ ایسے کیسے، اسے نکلنے کی اجازت دے سکتے ہیں، سر۔ یہ دنگا فساد کرنے والی ہے۔ ہم ان لوگوں کے ہاتھوں دب نہیں سکتے۔" وہ بلند آواز میں بولا۔ وہ کسی صورت یاسمین کی آزادی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

لوئیس کے چہرے کے رنگ اڑ گئے۔

"ہمارے پاس کوئی اور راستہ نہیں۔ البرٹ دھوپ میں سڑ رہا ہے، یہ خبر فرینک ونسٹن تک پہنچ چکی ہے۔ ہمیں اوپر سے احکام آئے ہیں۔" لوئیس کی آواز نرم ہوئی۔

جیمس آنکھوں میں درشتی لیے انہیں دیکھتا گیا۔

"نہیں سر۔ ہم اپنی سلطنت سے بغاوت کرنے والوں کو یوں نہیں چھوڑ سکتے۔ آپ کیسے ہار مان سکتے ہیں؟ ہم کیسے انہیں جیتنے دے سکتے ہیں؟" آواز بلند ہونے لگی۔

لوئیس نے ہاری ہوئی سانس خارج کی۔

"ہم بے بس ہیں، جیمس۔"

"مگر سر۔۔"

جیمس کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ لوئیس کھڑے ہوئے اور اسے خاموشی طلب نظروں سے دیکھنے لگے۔

"آرڈرز پکے ہیں، جیمس۔ ہمیں اسے نکالنا ہو گا۔" سست چال چلتے وہ اس کے مقابل کھڑے ہو گئے۔

جیمس نے ان کی آنکھوں میں کچھ معنی خیز دیکھا تھا۔ اور پھر ان کے لبوں کو ایک فتنہ گر مسکراہٹ میں پھیلتا دیکھ کر، اس نے تصدیق کر لی تھی کہ وہ بھی اس کی طرح ہار تسلیم کرنے والے نہ تھے۔

لوئیس جیمس کے کان کی جانب جھکے۔ آنکھوں میں عیاری اتری۔

"ابھی نکال دو۔ آگے وہ مسئلے نہ پیدا کرے، اس کی ذمہ داری تمھارے اوپر ہے۔" کانوں میں سرگوشی کی۔

لبوں پر پھیلی شیطانی مسکراہٹ سمیٹی اور سیدھے ہو گئے۔

جیمس کے لب پھیلے۔ بھوری آنکھوں میں شر کی آمیزش ہوئی۔

"کیا تم میری بات سمجھ رہے ہو، جیمس؟" وہ اعتماد سے بولتے اس کے کندھوں سے نادیدہ جھول جھاڑنے لگے۔

جیمس نے سر کو ادب سے خم دیا۔

یاسمین کو مات دینا، اس کی انا کا معاملہ بن چکا تھا۔

اور وہ اپنی انا کو زخمی کرنے والوں کے ساتھ سمجھوتے کرنے کا قائل نہ تھا۔

.....☆☆☆.....

انہیں ڈیرہ ڈالے ہوئے پانچ دن بیت چکے تھے، مگر ان کی ہمت اب تک پسماندہ نہ ہوئی تھی۔ گزشتہ دنوں سے، وہ اپنی خوراک کو بالائے طاق رکھے ہوئے تھے، صرف اور صرف عدل کی خاطر۔

البرٹ کا حال بد حال ہو چلا تھا۔ جسم سوکھ چکا تھا اور چہرے کا ہر زاویہ مرجھا گیا تھا۔ اس پر سب خود بیت رہی تھی اس لیے اسے یاسمین کی باتوں کی سمجھ آنے لگی تھی۔ اس نے ٹھیک ہی تو کہا تھا کہ جو لوگ احتجاج کرتے ہیں، وہ نہایت اذیت سے دوچار ہوتے ہیں، مگر پھر بھی اپنی ذات کو اس تکلیف سے گزارتے ہیں۔ بلاشبہ، یہ کام آسان نہیں۔

کال کوٹھری کے اندر یاسمین گھٹنوں کے بل بیٹھی تھی۔ چہرا ہمیشہ کی طرح ٹھنڈا ٹھار تھا، اور آنکھیں پر سکون اور بے خوف۔

جیمس وہاں پہنچا تو اپنی آنکھوں کی حیرت وہ خود بھی چھپا نہ سکا۔ وہ لڑکی آخر ٹوٹتی کیوں نہ تھی؟ ان کے کسی حربے نے اس پر اثر کیوں نہ کیا؟ وہ اسے دیکھتے، خود سے سوال کر رہا تھا۔

"آزاد کر دو اسے۔" وہ اسے ناگواری سے دیکھتے بولا تو سپاہی چوکنّا ہوئے۔

اس نے یاسمین کے ردِ عمل پر غور کیا، مگر یاسمین میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ وہ بدستور اطمینان کے ساتھ بیٹھی رہی۔ جیمس کو پہلے سے زیادہ حیرت ہوئی۔

کال کوٹھری کا دروازہ کھل چکا تھا۔

"تم جا سکتی ہو۔" وہ تذبذب کے عالم میں بولا تو وہ کھڑی ہو گئی۔

اس کے دل میں مسرت سی ابھر گئی۔ اس کا جسم چیخ رہا تھا، چال بھی کمزور تھی، مگر اس نے اپنے چہرے پر تکلیف کے آثار جھلکنے نہ دیے۔ وہ اسی رعب کے ساتھ باہر کا سفر طے کر رہی تھی، جو اس کی شخصیت کا حصہ بن چکا تھا۔

البرٹ نے جیسے ہی تھانے سے باہر آتی یاسمین کو دیکھا، اس کے اندر توانائی بھر گئی۔ دل بے قابو ہو گیا اور وہ کھڑا ہو گیا۔ لب بے ساختہ مسکرانے لگی اور آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہ اب بھی ویسی ہی تھی، حوالات کی سختیوں نے نہ اس کی چال میں پنپتی شان و شوکت چھینی تھی، نہ ہی اس کی گردن کی اکڑ۔

البرٹ کو احساس ہوا، کہ وہ اس دیدار کے لیے ترس چکا تھا۔ ان سیاہ آنکھوں کو دیکھ کر اسے ٹھنڈک ملی تھی۔

احتجاجیوں میں شور و غل پھیلنے لگا اور وہ سب کھڑے ہونے لگے۔ سب کے چہروں پر مسکراہٹ سجی تھی، آنکھیں جیت کا جشن منا رہی تھیں۔ یاسمین کے دیدار نے، ان سب کے لیے کسی خوراک کا کام کیا تھا۔

ان کی آنکھیں، مسکراہٹیں دیکھ کر یاسمین کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے آسمان کو تک کر معبودِ حقیقی کا شکر ادا کیا پھر اپنے لوگوں کو دیکھا۔

اب وہ ان کے سامنے کھڑی تھی۔ دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

"جے ہند!" وہ ہاتھ اٹھا کر بلند آواز میں بولی تو سارا ہجوم اس کے پیچھے نعرہ بلند کرنے لگا۔

"جیے ہند!" اور وہ لوگ بدستور نعرے بلند کر کے اپنی جیت کا جشن منانے لگے۔

ان سب کی آنکھوں میں امید کی رمق تھی۔

البرٹ یاسمین کو دیکھ کر فخریہ سا مسکرایا۔

یاسمین کی نگاہیں اس پورے ہجوم سے ہوتے ہوئے اس شہد رنگ آنکھوں والے مرد پر ٹکیں۔ ان آنکھوں میں کوئی عناد، کوئی نفرت نہ تھی۔ جب کہ وہ نفرت کی حقدار تھی۔ وہ سب بھلا کر، اس کی رہائی کا جشن منا رہا تھا۔

آخر ہر انسان البرٹ جیسا کیوں نہیں ہو سکتا؟ اس نے اندر ہی اندر سوچا۔

.....☆☆☆.....

چمنِ گلاب ایک بار پھر سے آباد ہو گئی تھی۔

وہ بیکری جو پچھلے ہفتے سے ویران تھی، آج اس میں شور و غل پھیلا ہوا تھا۔ دروازہ کھلنے پر وہی گھنٹی کی آواز گونجتی۔ ایک بار پھر سے چمنِ گلاب کیکس اور بسکٹس کی مہک سے جی اٹھی تھی۔

باورچی خانے میں یاسمین ڈبل روٹی کا اٹا گوندرہی تھی۔

ٹھیک اسی وقت دروازہ کھلا۔

عام حالات میں، وہ نظریں نہیں اٹھاتی تھی، مگر آج جو آیا تھا، وہ اس کے انتظار میں تھی۔

بھاری بھر کم روشی سست قدم بڑھاتے اندر داخل ہوئی تھی۔

"لڑکیوں!" اس کی کرخت آواز گونجی تو سب نے اپنا کام روک لیا۔

روشی بوکھلاہٹ کے عالم میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"سب کمرے سے چلی جاؤ۔ ہمیں اور روشی کو تنہا چھوڑ دو۔" سیاہ آنکھوں میں سختی در آئی۔

ملازمین نے حکم کی اطاعت کرتے سر کو خم دیا اور باورچی خانے کو خیر باد کہہ دیا۔

باورچی خانے کی اس پر اسرار فضا میں وہ دونوں تنہا تھے۔

یاسمین قدم قدم بڑھاتے روشی کے مقابل کھڑی ہوئی۔ کچھ دیر وہ یک ٹک اسے دیکھتی گئی۔

"یاسمین صاحبہ، آپ نے عجلت میں بلایا اس لیے میں آگئی۔" روشی کی آواز لڑکھڑائی۔

"دو دنوں سے چمنِ گلاب کھلی ہوئی ہے۔ سب خیریت ہے۔" وہ ٹھنڈے ٹھار لہجے میں بولی۔

روشی کی گردن بے ساختہ جھک گئی۔

"میری۔۔۔ میری طبیعت ناساز تھی۔ میں خبر نہ پہنچا سکی۔" آواز ہنوز لرز رہی تھی۔

"طبیعت ہی خراب تھی، یا آپ کو شرم وندامت کے حصار نے چمنِ گلاب واپس نہ آنے دیا؟" وہ چبا چبا کر بولی۔

روشی کے اوپر فضا کا تناؤ بڑھنے لگا۔ اسے لگا جیسے کوئی اس کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ اس نے نظر اٹھا کر یاسمین کی خونخوار آنکھوں میں دیکھا تو اس کا سانس تک لینا محال ہو گیا۔

وہ جان گئی تھی کہ یاسمین اس کے اعمال کی ناپاکی سے باخبر تھی۔ آنکھوں کے گوشے نم ہوئے۔ دل نچوڑنے لگا۔

"میں۔ میں بہت شرمندہ ہوں اپنے فعل پر مگر۔۔۔" وہ بول ہی رہی تھی کہ یاسمین کی گرجدار آواز نے اس کی بات کاٹ دی۔

"بس کریں روشی!" اس نے ہاتھ ہوا میں بلند کیا۔ "جس تھال میں کھایا، اسی میں چھید کیا؟ کیا آپ کو ایسا لگا تھا کہ ہم روز روز آپ کی نئے نویلے زیورات نہیں دیکھتے تھے؟ کیا آپ بھول گئی تھیں، کہ ہم آپ کے حالات سے با خبر تھے۔" یاسمین کا چہرا سُرخ ہوا اور سانسیں تیز۔

روشی نے نظریں اٹھائی رکھیں، مگر گردن کو اب وہ اٹھا نہ پائی۔

"آپ غربت وافلاس میں مبتلا تھیں، تب ہم آپ کو چمنِ گلاب میں لے کر آئے تھے، تاکہ آپ اپنے بچوں کو عزت کی کمائی روٹی کھلا سکیں۔ نہیں نہیں، ہم نے کوئی احسان نہیں کیا، نہ ہی ہماری کوئی عنایت تھی، یہ اللہ کا کرم تھا آپ پر۔ اس نے آپ کو عزت بخشی تھی۔ مگر آپ نے، آپ نے اس عزت کو لات مار کر، اپنے ہی لوگوں کے ساتھ دغا کر دی؟ کیا شرم نہیں آئی آپ کو؟" وہ خاموش ہوئی۔ سانسیں اب تک پھول رہی تھیں۔

روشی کی آنکھوں سے آنسو تیر کر رخساروں کو بھگو تے۔

"مجھے معاف کر دیں یاسمین صاحبہ۔ زیورات کی لالچ نے مجھے اندھا کر دیا تھا۔ میں نے چور راستہ اختیار کرنا چاہا۔ مگر یقین کریں، اس رات سے آج تک میں سکون کی نیند نہیں سو سکی۔ جب تک آپ قید میں رہی تھیں، میں مصلے پر بیٹھ کر آپ کے لیے دعائیں مانگتی رہی۔" روشی کی آواز رقت آمیز ہوئی۔ چہرا آبدیدہ تھا۔

یاسمین نے گردن نفی میں ہلائی۔

"اپنی دعائیں، اپنے پاس رکھیں روشی۔ ہمیں ان کی ضرورت نہیں۔" وہ لہجے میں کاٹ لیے بولی۔

"پتہ ہے، آج ہم آپ کو گردن اٹھانے کا نہیں بولیں گے۔ کیونکہ آپ جیسے دغاباز جھکی گردنوں کے مستحق ہیں۔ ابھی اسی وقت، ہماری نظروں سے خود کو دور کر دیں، روشی۔ آپ پر بس ایک آخری التفات یہ کر دیں گے کہ آپ کے جرم کا اسخار اپنے اور خدا کے بیچ رکھیں گے۔ اس کے علاوہ ہم سے کسی عنایتِ خاص کی توقع نہ رکھیے گا۔" اس نے تلخ لہجے میں حکم سنایا۔

روشی نے گردن نفی میں ہلاتے اوپر اٹھائی۔

"ایسے نہ کریں، یاسمین صاحبہ۔ میں واقعی نادم ہیں۔ میں اپنی غلطی کو درست کرنا چاہوں گی۔" وہ منت کرنے لگی۔

یاسمین نے نظریں پھیر لیں۔

"غلطیاں درست کرنے کا وقت چلا گیا ہے، روشی۔ ساری کوششیں بے فیض ہیں۔ عافیت اسی میں ہے، کہ اب آپ یہاں سے چلی جائیں۔" اس نے جو کہنا تھا، وہ کہہ چکی تھی۔ میز کے پیچھے پہنچ کر وہ پھر سے آٹا گوندھنے لگی۔

روشی شاک کے عالم میں یاسمین کو دیکھنے لگی۔ وہ رحم دل یاسمین، جس نے اسے بیکری میں جگہ دے کر رحم بخشا تھا، آج سنگدل ہو گئی تھی۔ اسے خود کے کیے پر گہرا افسوس ہوا۔

تھک ہار کر وہ وہاں سے رُخصت ہو گئی۔

اس کے پیچھے، یاسمین نے ٹھنڈی سانس خارج کی۔

چہرے پر فکر مندانہ لکیریں پھیلیں۔ اسے بس ایک ہی خیال ستا رہا تھا۔

کیا روشی جیسے کھوٹی نیت والے لوگوں کے ہوتے ہوئے، وہ واقعی کامیاب ہو سکتے تھے؟

.....☆☆☆.....

وہ سرائے کے اس کمرے میں، نیم دراز سا ہو کر سو رہا تھا۔ کمرے میں ہر طرف اس کے کھراٹے گونج رہے تھے۔

یکبارگی دروازے پر دستک ہوئی تو وہ بیدار ہوا۔

"مسٹر البرٹ۔ چمنِ گلاب سے آپ کا سامان آیا ہے، اور ایک خط بھی۔" الفاظ کان میں داخل ہونے کی دیر تھی کہ وہ اٹھ بیٹھا۔ ساری غنودگی زائل ہو چکی تھی۔

اس نے بلا تاخیر دروازے کا رُخ کیا اور اسے کھولا۔ مسکرا کر اس نے بھورا لفافہ اور وہ خط موصول کیا۔ ہفتے بھر سے، اس کی طبیعت ٹھیک نہ تھی، اس لیے یاسمین سرائے میں اپنی بیکری کی کوئی سوغات اسے پہنچا دیتی تھی۔

البرٹ نے بھورا لفافہ میز پر رکھا اور وہ خط کھول کر پڑھنا شروع کیا۔

"البرٹ،

امید کرتے ہیں، تم بخیریت ہو گے اور صحتیابی کی طرف لوٹ رہے ہو گے۔ ہمیں اطلاع ملی کہ تم دو دن بعد برطانیہ لوٹ رہے ہو۔

اگر آج بہتر محسوس کرو تو مغرب کے بعد ہمارے گھر کے باہر آ جانا۔ ہم تمہیں کچھ دینا چاہتے ہیں۔

یاسمین۔"

اس خط کو پڑھتے ہی البرٹ کے چہرے پر مسکان بکھر گئی۔ ساری تکان کا صفایا ہو چکا تھا۔

مغرب تک اس نے وقت کیسے کاٹا تھا یہ بات صرف وہی جانتا تھا۔ بار بار اسے یہ خیال ستاتا کہ یاسمین اسے دینے کیا والی تھی۔

.....☆☆☆.....

آسمان گہرا جامنی رنگ کا ہو چکا تھا۔

گلی کے اس حصے سے ٹھنڈی ہوائیں گزر رہی تھیں۔ وہ اس کے گھر کے باہر کھڑا، اس کیاری کو تک رہا تھا، جس میں گلاب کے پھولوں کے ساتھ یاسمین کے پھول بھی کھلے ہوئے تھے۔

یکبارگی گلی کے کونے میں اسے یاسمین کا ہیولہ نظر آیا۔ وہ چوکنّا ہو گیا۔

شہد رنگ آنکھیں خوشیوں سے بھر گئیں۔ وہ جیسے جیسے اس کے قریب آ رہی تھی، اس کی خود ساختگی میں اضافہ ہوتا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ اس کے عین سامنے کھڑی تھی۔

گندمی لڑکی اس دراز قد مرد کو نظر اٹھا کر دیکھ رہی تھی۔

"اب کیسے ہو؟" اس نے نرمی سے پوچھا۔ آخر میں وہ مسکرا دی۔

وہ پہلے تو ایسے نہ مسکرایا کرتی تھی؟ البرٹ نے دل ہی دل میں سوچا۔

"آپ نے دعوت دی، تو ٹھیک ہونے میں ایک لمحہ نہ لگا۔" وہ چہرے پر مبہم مسکراہٹ سجائے گویا ہوئی۔

"اگر اتنا بے تاب تھے تو پہلے بتاتے، ہم پہلے ہی ملاقات کا دعوت نامہ بھیج دیتے۔" وہ شریر انداز میں بولی۔

البرٹ زیر لب ہنس کر، نظریں چرا گیا۔ رخسار سُرخی مائل ہوئے۔

اور وہ، وہ بس اسے دیکھتے گئی۔ اس کے چہرے سے نظریں ہٹانے کا دل ہی نہیں کرتا تھا۔

"تم ادھر رکو، ہم ابھی آئے۔" لبوں پر رازدارانہ مسکراہٹ سجائے گویا ہوئی۔

البرٹ نے نظریں اٹھائیں۔ نگاہیں بے تاب اور منتظر تھیں۔

"چلیں شکر۔ میرے دماغ میں کب سے یہی کھجلی ہو رہی ہے، کہ آخر آپ، مجھے دینے کیا والی ہیں۔"

"جو بھی ہے، تمہیں بہت اچھا لگے گا۔" اتنا سا کہہ کر وہ چلی گئی۔

کچھ ساعتیں البرٹ نے انتظار میں کاٹ دیں۔ دل بے چینی کے عالم میں مچل رہا تھا۔

وہ دروازے پر نمودار ہوئی، تو البرٹ نے آنکھوں میں منت لیے اسے دیکھا۔ اب وہ اس کے سامنے کھڑی ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں، بھورے چمڑے کے سرورق والی ایک کتاب تھی۔

"آخر کیا دینا ہے، یاسمین؟" وقت واقعی اس کی صبر آزمائی کر رہا تھا۔

اس کی بے قراری دیکھ کر یاسمین کھکھلا دی۔

اس نے وہ کتاب آگے بڑھائی تو البرٹ نے آنکھوں میں سوال لیے اسے تھام لیا۔

جیسے ہی اس نے کتاب کھولی اس کی آنکھوں میں خوشگوار حیرت پھیلی۔

اور بس۔۔۔ یاسمین کو لگا جیسے اس منظر سے زیادہ حسین اس نے کچھ نہ دیکھا تھا۔ جب وہ خوش ہوتا تھا تو وہ خود کو مکمل محسوس کرتی تھی۔

"اسے تم، ہمارا معافی نامہ سمجھ لو۔" اس نے مسکراہٹ سمیٹ کر سنجیدگی سے کہا۔ "ہم نے تمہیں غلط جان کر، تمھاری نیت پر شک کر کے بہت بڑی غلطی کی۔ امید ہے تحفہ تمہیں پسند آئے گا۔" وہ خلوص سے بولی۔

البرٹ نے کتاب سے نظر اٹھا کر یاسمین کو دیکھا۔

"میں آپ سے کبھی خفا ہوا ہی نہیں۔" اس نے کہہ کر وقفہ لیا۔ "شاید خفا ہو ہی نہیں سکتا۔" آواز دھیمی ہوئی۔ اس نے سلسلۂ کلام جوڑتے بات جاری کی۔

"اور میں اس تحفے کے لیے لفظوں میں آپ کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔ میں انگلینڈ پہنچ کر ایک ایک ترکیب بناؤں گا، اور تفصیلی تبصرے خطوط میں لکھ کر آپ کو بھیجا بھی کروں گا۔"

انگلینڈ کا سنتے ہی یاسمین کی مسکراہٹ پھیکی پڑی۔ البرٹ نے بھی اس کی سمٹتی مسکراہٹ پر غور کیا تھا۔ دل میں کہیں چبھن ہوئی۔

"کاش میں، کاش میں ساری زندگی ہندوستان میں رہ سکتا۔" اس کا جوش و خروش دھواں دھواں ہوا اور مسکراہٹ سمٹ گئی۔

یاسمین کی سیاہ آنکھوں کی چمک ماند پڑی۔ ان میں ایک آس سی پنپی، ایسی آس، کہ جس کا اظہار وہ نہیں کر پا رہی تھی۔ مگر وہ اس اظہار کی مترقّب تھی، وہ ضد کر رہی تھی۔ اور ڈھیٹوں کی طرح اس ضد کو نظر انداز بھی کر رہی تھی۔

"مگر کس حیثیت سے رہوں گا، یاسمین؟" اس نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ دل زور و شور سے دھڑک رہا تھا۔

خاموشی حائل ہوئی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے گئے، وہ کچھ نہ کہہ کر بھی بہت کچھ کہہ گئے تھے۔

پیغامات نے سفر طے کیا، ایک دل سے دوسرے دل تک۔

"ہم تمہیں بدائی کہنے ضرور آئیں گے، البرٹ۔" وہ سرد لہجے میں بولی۔ ایک دفعہ پھر سے، وہ اپنے کرب کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

پچھلی بار کے برعکس، البرٹ اس کرب کو پل بھر میں بھانپ چکا تھا۔

"چلا بھی جاؤں تو۔۔۔" البرٹ نے نظریں جھکائیں۔

یاسمین نے جواب طلب نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"تو؟" وہ بے اختیار بولی۔

البرٹ نے نظریں اٹھائیں۔ شہد رنگ آنکھوں میں محرومی تھی۔

"چلا جاؤں گا، مگر اپنے وجود کا ایک حصہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہاں چھوڑ جاؤں گا، یاسمین۔" وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولا اور اسے پورے وثوق سے دیکھنے لگا۔ آج وہ اسے جی بھر کر دیکھ لینا چاہتا تھا۔

یاسمین کے حلق میں آنسوؤں کا پھندا اٹک گیا۔ وہ مزید اپنے جذبات کی نفی نہیں کر پا رہی تھی۔ مگر ان جذبات کا فائدہ ہی کیا، جن سے کچھ حاصل ہی نہ کیا جا سکتا تھا۔

وہ دو مختلف راہوں کے مسافر تھے۔

راہیں ملی تو تھیں، مگر ان کی تقدیر میں تھا جدا ہونا۔

جدائی کا وقت سر پر کھڑا تھا۔

اور جدائی سے زیادہ تکلیف دہ بھی کچھ ہوتا ہے کیا؟

"شاید تمہیں جانا چاہیے۔ دیر ہو رہی ہے۔" اسے تکلیف ہو رہی تھی۔

البرٹ نے اس کی آواز میں گھلی نمی محسوس کی تھی۔

اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ ہونٹ ایک مرتبہ پھر تبسم میں ڈھلے۔

وہ کچھ کہنے ہی لگا تھا، مگر پھر اس کی مسکراہٹ بجھ گئی۔ آنکھوں کو پتلیاں سکڑ گئیں۔ اسے گلی کے کونے میں، دیے کی زرد روشنی میں ایک چہرا نظر آیا۔۔۔

ایک شناسا چہرا۔۔۔

اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ شہد رنگ آنکھیں خوف کی شدت سے کپکپائیں۔

یاسمین نے اس کے بدلتے انداز دیکھے تھے۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں الجھن ابھری۔

البرٹ نے یاسمین کے کندھوں پر ہاتھ رکھا اور اس کے ساتھ گول چکر کھایا۔ اب وہ یاسمین کی جگہ پر تھا، اور یاسمین اس کی۔ یاسمین بوکھلائی ہوئی تھی، اور اس کے عمل کو سمجھنے کی کوشش کر ہی رہی تھی کہ یکدم گلی میں گولی کی زوردار آواز گونج اٹھی۔

ساری دنیا تھم گئی۔

سانسیں جو جاری ہونی تھیں، وہ اٹک گئیں۔

دل جسے دھڑکنا تھا، وہ لحظہ بھر دھڑکنا بھول گیا۔

اس نے گلی کے کونے میں دیکھا، وہاں جیمس کھڑا تھا، جس کے ہاتھ میں لوہے کی پستل تھی۔ اس کے چہرے پر خوف وانتشار پھیلا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ سے پستل چھوٹ کر زمین پر جا گری۔ اس نے غلط انسان پر گولی چلا دی تھی۔ اس نے پہلی فرصت میں راہِ فرار اختیار کی۔

اس نے پستل کے زمین سے ٹکرانے کی آواز بھی سنی تھی۔

اس نے اپنے سامنے دیکھا۔

شہد رنگ آنکھیں تکلیف میں جھلس رہی تھیں۔

سفید چہرے پر کرب سمایا ہوا تھا۔

ہونٹ سفید پڑ گئے تھے اور لرزش میں مبتلا تھے۔

سیدہ یاسمین مجاہد کو لگا کہ اس کی روح کسی نے چھلنی کر دی تھی۔

وہ اس کے سامنے زمین میں ڈھیر ہوا تھا۔ اس نے جھک کر اس کا سر فرش پر ٹکرانے سے روکا۔ سیاہ آنکھیں آنسو بہانے لگی تھیں۔ کان کچھ بھی سننے سے قاصر تھے۔

آنکھیں البرٹ کے علاوہ کچھ بھی دیکھنے کی صلاحیت کھو بیٹھی تھیں۔

"البرٹ!" اس کے لب ہلے، مگر وہ کچھ بول نہ سکی۔۔۔

"البرٹ!" اپنی مدھم آواز اسے خود سنائی دی۔

"البرٹ!" اب کہ اسکی دل خراش چیخ سنائی دی۔

"البرٹ!" آواز سے توانائی جا چکی تھی۔

البرٹ نے اکھڑتی سانسوں کے درمیان اسے دیکھا۔ جسم میں تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ تکلیف میں تھا، مگر یاسمین کو کرب میں دیکھنا اس پر گراں گزر رہا تھا۔ وہ اس کے آنسو پونچھ دینا چاہتا تھا، مگر اس کے ہاتھوں نے اس کا ساتھ نہ دیا "یاسمین!" آواز کمزور اور لرزش زدہ تھی۔

یاسمین خاموش ہوئی۔ اپنی سسکیوں کا گلا گھونٹ کر وہ اسے سننے لگی۔

"مجھے آج سمجھ آیا ہے کہ آپ سب اس زمین کے لیے جانیں قربان کرنے کو کیوں تیار ہو جاتے ہیں۔" اس نے وقفہ لیا۔ تکلیف کے باعث، بولنا دشوار تھا۔

"کیونکہ آپ سب اس زمین سے محبت کرتے ہیں۔ سچی محبت۔" وہ اونچی اونچی سانسیں لینے لگا۔

یاسمین کے آنسو بہنے کا سلسلہ شروع ہوا۔

"میں بھی اپنے آپ کو آپ کے لیے قربان کرتا ہوں یاسمین۔ کیونکہ۔۔۔" جسم سے جان نکلنے لگی تھی۔

یاسمین اسے دیکھتے گردن نفی میں ہلانے لگی۔

"البرٹ! تم نہیں جا سکتے۔ تم نے برطانیہ پہنچ کر سب بنانا تھا نا۔" وہ پاگلوں کی طرح رو رہی تھی۔ "تم نے مجھے خط بھی لکھنے تھے البرٹ۔"

"کیونکہ یاسمین۔۔۔" اس نے بات جاری رکھی۔ ہاتھ کپکپانے لگے تھے۔

"مجھے آپ سے سچی محبت ہو گئی تھی۔"

سانس کا ٹانکا ٹوٹ گیا۔

جسم نے حرکت کرنا بند کر دی۔

روح جسم کے پنجرے سے آزاد ہو گئی۔

شہد رنگ آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی۔

مگر افسوس۔۔۔

اب ان کی چمک، کبھی بھی لوٹائی نہیں جا سکتی تھی۔

.....☆☆☆.....

چھ ماہ بعد۔۔۔

سرائے کا وہ کمرہ ویران پڑا تھا۔

کمرے کی فضا بوجھل اور اداس تھی۔

شاید اب تک وہ اپنے پرانے مالک کو یاد کرتی تھیں۔

وہ اس کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ سیاہ آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے تھے۔ رنگت بجھی بجھی، چال مرجھائی ہوئی۔ اپنے سر پر اس نے کستی سے ڈوپٹہ باندھا ہوا تھا۔

وہ الماری میں موجود اس کے کپڑوں کو دیکھ رہی تھی، اپنے ہاتھوں سے انہیں محسوس کر رہی تھی۔ وہ پچھلے چھ ماہ سے وقتاً فوقتاً یہاں آتی تھی۔ یہ کمرہ خالی نہ ہو جائے اس لیے اس کا کرایہ تک ادا کر دیتی تھی۔ مگر آج، یہ کمرہ خالی ہو جانا تھا۔ اور وہ اسے خالی ہو جانے سے روک بھی نہیں سکتی تھی۔

اسے وہ شدت سے یاد آیا۔

اور اسے بھلایا بھی کیسے جاتا؟

سیاہ آنکھیں نم ہوئیں۔

ٹھیک اسی وقت دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو وہ خود ساختہ مڑ گئی۔ عمر رسیدہ برطانوی مرد کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ ان کے چہرہ بے رونق تھا۔

بالآخر اس کمرے کے خالی ہو جانے کی وجہ آچکی تھی۔ وہ فرینک ونسٹن تھے، جو ایک طویل سفر کے بعد ہندوستان آئے تھے۔

یاسمین جانے ہی لگی تھی کہ ان کی گرجتی آواز نے اس کے قدم روک لیے۔

"رکو!" وہ نرمی سے بولے اور اس کی طرف بڑھنے لگے۔

یاسمین تذبذب کے عالم میں اپنی جگہ پر کھڑی ہو گئی۔ وہ اس کے مقابل کھڑے ہوئے۔

"آپ ہیں یاسمین؟" بدستور نرمی سے بولے۔

یاسمین نے گردن ہاں میں ہلائی۔

فرینک ونسٹن کی آنکھیں اس لڑکی کی آنکھوں میں پنپتے رنج کو دیکھ کر نم ہوئیں۔

"تو آپ ہیں وہ، جس کے لیے میرے بیٹے نے جان دی۔" آواز پہلے سے بھی زیادہ ملائم ہوئی۔

یاسمین کے حلق میں آنسوؤں کا پھندا اٹک گیا۔ وہ انہیں پی جانے میں ماہر تھی۔ مگر آج، وہ انہیں چاہ کر بھی نہ پی سکی۔ آنکھوں سے بہتے آنسو اسکے گندمی رخسار بھگوتے چلے گئے۔

"آپ کی جان، یقیناً بہت قیمتی ہو گی۔ اچھا لگا آپ سے مل کر۔" وہ آنکھوں میں آئی نمی کو رگڑتے بولے۔

یاسمین نے گردن کو جنبش دی۔

"مجھے آپ یہ بتا سکتی ہیں، کہ یہ قتل کس نے کیا ہے؟" انھوں نے سوال کیا تو یاسمین کے ذہن کے خانوں میں اس رات کا منظر چکر کاٹنے لگا۔

"جیمس۔ پولیس افسر ہے وہ۔ وہ ہمیں مارنے آیا تھا۔ سزا کے خوف سے وہ نہ جانے کہاں چھپا بیٹھا ہے، مگر ہمیں یقین ہے آپ اسے بخشیں گے نہیں۔" وہ چاہ کر بھی آواز ہموار نہ رکھ سکی۔ اندر سے ٹوٹ جو گئی تھی، رعب و دبدبا سب خس و خاک تلے دب مسخ ہو چکا تھا۔

فرینک کی آنکھوں میں شعلہ بھڑک اٹھا۔

"بالکل۔ اس کو سزا دلوائے بغیر میں چین سے نہیں بیٹھوں گا۔" وہ اٹل انداز میں بولے۔

یاسمین کی آنکھوں میں نفرت ابھری۔ وہ بھی اس دن کا انتظار کرے گی۔

کچھ دیر دونوں کے درمیان خاموشی حائل رہی۔ وہ اس لڑکی کو دیکھ رہے تھے، جس کی آنکھوں سے ایسا لگتا تھا وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔

"کیا ہم آپ سے ایک درخواست کر سکتے ہیں؟" بالآخر وہ بول اٹھی۔

"جی، ضرور۔" فرینک ونسٹن نے جواب دیا۔

یاسمین نے مڑ کر اس میز کو دیکھا، جہاں اس کے کاغذات پھیلے ہوئے تھے۔

"ہم جانتے ہیں، اس کی ساری اشیاء آپ لے جائیں گے۔ اور یہ کاغذات بھی۔ مگر کیا آپ اس کتاب کو چھپوا کر، اس کی ایک جلد ہمیں بھجوا سکتے ہیں؟" اس کی التجائیہ آواز نے کمرے کا سکوت توڑا۔

فرینک نے اس لڑکی کی آواز میں کرب محسوس کیا، تو ان کا دل پسپا ہو گیا۔

"ضرور بیٹی۔ میں آپ کو ضرور بھجوا دوں گا۔" وہ نرمی سے گویا ہوئے۔

"ہم انتظار کریں گے۔"

اتنا سا کہہ کر وہ کمرے سے نکل گئی۔

باہر کا سفر طے کرتے ہوئے اسے البرٹ شدت سے یاد آیا۔

اور پھر سرائے کے باہر اس کی سائیکل دیکھ کر اس کا رونے کا جی چاہا۔

یا اللہ! کیا اب وہ ایسے ہی یاد آتا رہے گا؟

وہ سائیکل کے سرہانے کھڑے، اسے محویت سے دیکھتے یہی سوچ رہی تھی کہ۔

البرٹ تو اس سے اپنی محبت کا اقرار کر چکا تھا۔

مگر وہ، وہ بد قسمت تھی جو کبھی اپنی محبت کا اظہار نہ کر سکی۔

وہ اس کی محبت کا اقرار سننے سے پہلی ہی چلا گیا۔

.....☆☆☆.....

دسمبر، ۱۹۴۵

امرتسر، ہندوستان

وہ دن آج بھی یاد بڑے آتے ہیں

جب شامیں یہ سہانی ہوتی تھیں

کہ آپ ہمارے ہم راہ تھے،

باغ کی اس بینچ پر،

درختوں کی چھاؤں تلے،

ہم زمانوں کی باتیں کرتے تھے،

آپ کچھ ہماری سنتے تھے۔

کچھ اپنی سناتے تھے۔

مگر وقت نے صفحے پلٹائے اپنے،

جوہر کچھ سفاک دکھائے اپنے

کر دی راہیں ہماری جدا کچھ اس طرح

کہ نہ ہے امیدِ وصل،

نہ ہی ملا دل کو قرار۔

اور دل سے چمٹ گیا ناختم ہونے والا ملال

ہاں کیا ہوا باغ کی وہ بینچ آج بھی وجود رکھتی ہے

ہوائیں آج بھی احاطہ اس کا کرتی ہیں

زندگی اب کہ یک رنگ ہوئی چلی ہے

کیونکہ آپ جو اب اس میں نہیں ہیں۔

سب کچھ ہے، بس آپ ہی تو نہیں ہیں!

ملے تھے جو راہِ غیر میں آپ ہمیں،

نہ جانتے تھے بچھڑنا قسمت میں لکھا تھا۔

ہاں بہت کچھ جو کہنا تھا کہہ نہ سکے

مگر روگ تقدیر نے اتنے دیے،

ہم مزید گلے کیونکر کریں؟

امر تسر کی گلیاں، سائیکلوں کی رنگ رنگ، بچوں کی چہچہاہٹ سے بھری ہوئی تھیں۔ سورج کی کرنیں، اب کہ پر زور نہ تھیں۔ خنکی امر تسر کے احاطوں پر سوار تھی۔ آج کے دن باشندے موٹے کپڑوں کی تہوں میں دبے نظر آئیں گے۔

ایسی ہی ایک سڑک پر وہ چل رہی تھی۔ وہی، جسے سب یاسمین بلاتے تھے۔

جس کے چہرے پر عمر کی لکریں تھیں۔ بال سیاہ تھے، مگر کچھ لٹیں سفید پڑ رہی تھیں۔ مگر آج بھی، اس کے چہرے کا رعب بر قرار تھا۔ آج بھی اس کی گردن ترشان اکڑی ہوئی تھی۔ آج بھی، مرد حضرات اسے دیکھتے ہی نظریں جھکا لیتے اور اسے سلام پیش کرتے۔

اس کے پیچھے، ایک شہد رنگ آنکھوں والا برطانوی نوجوان چل رہا تھا۔ ہاتھ میں کاغذ اور قلم لیے وہ اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلے اطمینان سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اس نوجوان کی موجودگی سے نہ صرف با خبر تھی، بلکہ اسے کوئی مسئلہ بھی نہ تھا۔

تب ہی اس گلی سے ایک بگھی گزری۔ یاسمین تھم گئی اور اس بگھی کو دیکھنے لگی۔

نوجوان بھی اس کے ساتھ رک گیا اور اس کی سیاہ آنکھوں کو بغور نے لگا۔

"ڈیوڈ۔ بھگیاں ہمیں البرٹ کی یاد دلاتی ہیں۔ ہم دو جمعے، اس کے ساتھ گئے تھے، اپنی بہنوں کو راشن دینے۔ ایک دفعہ رام باغ گارڈن بھی گئے تھے۔" وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔

ڈیوڈ نامی نوجوان اپنی کتاب میں کچھ تحریر کرنے لگا۔

"اب تو بگھیاں کم نظر آتی ہیں۔ زمانہ بدل رہا ہے۔" اس کی آنکھوں کے پاس جھریاں پڑیں۔ "مگر جب بھی بگھی دیکھتے ہیں، تو صرف وہ یاد آتا ہے۔" وہ کہہ کر پھر سے چلنے لگی۔

اس کی چال، جوانی کے دنوں کے برعکس سست ہو گئی تھی۔

وہ دونوں چمنِ گلاب کے سامنے تھے۔ یاسمین وہاں رک گئی، اور مخصوص جگہ پر انگلی سے اشارہ کرنے لگی۔

ڈیوڈ آنکھیں چھوٹے کر کے سڑک کے اس مقام کو دیکھنے لگا۔

"یہاں۔ وہ یہاں اپنی سائیکل لگاتا تھا۔ روز کچھ نہ کچھ نئی چیز خریدتا تھا۔" کہہ کر وہ چبوترا چڑھنے لگی۔

ڈیوڈ نے اپنی کتاب پر کچھ لکھتے اس کا پیچھا کیا۔

اندر داخل ہو تو میز سجی ہوئی تھی اور ملازمائیں کام میں مصروف تھیں۔

وہ چمنِ گلاب کے بیچ و بیچ رک کر ایک میز کی طرف اشارہ کرنے لگی۔

"یہاں۔" ڈیوڈ نے اس میز کو دیکھا" وہ ہمیشہ یہاں بیٹھتا تھا۔ اب اس میز پر ہم کسی کو بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتے۔ ہم روز کا اخبار یہاں رکھوا دیتے ہیں، کیونکہ وہ صبح صبح اخبار پڑھا کرتا تھا۔" پرانے وقتوں کو یاد کرتے ہوئے، وہ پھیکا سا مسکرا دی۔

مصروف ترین دن کا آغاز ہوا۔

سارا وقت ڈیوڈ یاسمین کے ساتھ رہا۔ وہ اس سے بہت باتیں کر رہی تھی۔ وہ اس سے سوالات پوچھتا۔ وہ جوابات دیتی۔ اور وہ ایک ایک چیز اپنی کتاب میں لکھ دیتا۔

مغرب کا وقت آ پہنچا تھا۔

سیدہ یاسمین ڈیوڈ کے سنگ واپسی کے سفر پر گامزن تھی۔

گھر کے باہر رک کر اس نے فرش پر اشارہ کیا۔

"یہاں۔" یاسمین کی آنکھوں میں خالی پن اتر آیا۔ "یہاں اس نے اپنی آخری سانسیں لی تھیں۔"

ڈیوڈ کی آنکھوں میں سائے سے لہرائے۔ فضا پر فسوں ہوئی۔

پھر یاسمین نے رُخ کیاری کی جانب موڑا۔

"یہ گلاب۔ ان کی بنیادیں اسی نے رکھی تھیں۔" وہ اداس سا مسکرائی۔

"اس کے قاتل کا کیا انجام ہوا، لیڈی یاسمین؟" جوان مرد نے موؤدبانہ انداز میں پوچھا۔

"سزائے موت۔" وہ گردن اکڑا کر بولی۔ "اس کے والد، فرینک ونسٹن نے اس پر ہلکا ہاتھ نہ رکھا۔" جواب دے کر اس نے گھر کا دروازہ کھولا

ڈیوڈ کی آنکھوں میں ستائش ابھری۔

"اندر آجاؤ۔ کچھ کھا کر جانا۔" وہ ٹھنڈے لہجے میں بولی۔

ڈیوڈ دعوت نامہ منظور کرتے اندر داخل ہوا۔

میز پر کھانا سجا ہوا تھا اور وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ڈیوڈ غور سے اس گھر کا جائزہ لے رہا تھا۔

"ایک سوال پوچھ سکتا ہوں، لیڈی یاسمین؟" وہ اسے دیکھتے بولا۔

اس کے سامنے بیٹھی یاسمین پھیکا سا مسکرائی۔

"اب تک اتنے پوچھے ہیں۔ روکا جواب روکیں گے؟"

ڈیوڈ جواباً شگفتگی سے مسکرایا۔

"سب نے کہا تھا، کہ آپ کبھی بھی مجھے اپنے اوپر کتاب لکھنے کی اجازت نہیں دیں گی۔ آپ ایک دیوار کی طرح ہیں، آپ کبھی بھی خود کو نہیں کھولیں گی۔ پھر آپ مجھ پر مہربان کیوں ہوئیں؟"

یاسمین کی سیاہ آنکھیں کسی سوچ میں ڈوبیں۔ پھر اس نے نظر اٹھا کر اس شہد رنگ آنکھوں والے نوجوان کو دیکھا۔

”سب درست کہتے ہیں۔ آپ کی شہد رنگ آنکھوں نے ہمیں آپ پر مہربان ہونے پر مجبور کیا۔ کیونکہ البرٹ کی آنکھیں بھی شہد رنگ تھیں۔“ آواز میں خالی پن کے ساتھ ساتھ کرب جھلک رہا تھا۔

ڈیوڈ زیر لب ہنس دیا۔

”کیا آپ مجھے ان کی کتاب دکھا سکتی ہیں؟ آپ کے پاس، سب سے پہلی جلد ہو گی۔“ ڈیوڈ نے التجا کی۔

یاسمین نے سر کو خم دیا پھر کھڑی ہوئی۔

کچھ دیر بعد وہ ایک کتاب کے ساتھ واپس آئی۔

اسے کپڑے کے اندر لپیٹا ہوا تھا۔ یاسمین نے اس کتاب کو میز پر رکھا۔ ڈیوڈ نے بہت احتیاط سے اسے اٹھایا اور کپڑے کی تہوں کو کھولا۔

اندر سے سفید سرورق والی خوبصورت کتاب برآمد ہوئی، جس کے سرورق پر ہندوستان کے مشہور مقامات کے نقش بنے تھے۔ ڈیوڈ کتاب کی خوبصورتی اور نزاکت دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

اس کے سرورق پر لکھا تھا: ”رنگوں کا دیس۔“

ڈیوڈ نے سرورق پلٹا۔ پہلا صفحہ اس کی آنکھوں کے سامنے اجاگر ہوا۔

”انتساب۔۔۔

یہ کتاب، میں سیدہ یاسمین مجاہد کے نام کرتا ہوں،

وہ بہادر لڑکی جس نے میری آنکھیں کھول دیں،

اور مجھے ایک مشکل، مگر اہم سچ سے متعارف کروایا۔“

ڈیوڈ نے ان لفظوں پر اپنا ہاتھ پھیرا۔ پھر کتاب بند کر کے، اسے کپڑے میں لپیٹ دیا اور میز پر رکھ دی۔

اس نے نظر اٹھا کر یاسمین کو دیکھا جو لاتعلق سی بیٹھی فرش پر کسی غیر مرئی نقطے کو تک رہی تھی۔

"کیا آپ مسکراتی نہیں ہیں، لیڈی یاسمین؟"

سوال پر یاسمین کی آنکھوں میں ویرانی در آئی۔

"ہم ہمیشہ سے ایسے نہ تھے، ڈیوڈ۔" اس نے پرفسوں توقف بھرا۔ "ہم سے زندگی نے پہلے ایک دفعہ مسکرانے کی وجہ چھینی۔ پھر البرٹ کو بھیجا، ہم نے مسکرانا دوبارہ سیکھا۔ لیکن زندگی نے ہمارے مسکرانے کی وجہ دوسری مرتبہ بھی چھین لی۔"

ڈیوڈ نے اس کی آواز میں گھلی نمی محسوس کی تھی۔

"کوئی آخری پیغام، کوئی آخری بات جو آپ چاہتی ہوں اس کتاب کا حصہ بنے؟" ڈیوڈ کی آواز نے اس رنجیدہ ماحول میں ارتعاش پیدا کیا۔

یاسمین نے کچھ دیر سوچ کر نظریں جھکائیں۔ پھر آنکھوں میں اعتماد لیے ڈیوڈ کو دیکھا۔

"ہم آنے والی نسل سے مخاطب ہیں۔ ہمارے لوگ، آزادی کے دہانے پر ہیں۔ وہ دن دور نہیں جب ہندوستان پر سے غیروں کا راج ختم ہو جائے گا۔ ہمارا دل گواہی دیتا ہے کہ ایک نسل ایسی آئے گی، جو آزادی میں اپنی آنکھیں کھولے گی۔ جو ذہنی طور پر آزاد ہو گی، جس کی آوازوں کو دبایا نہ جائے گا۔ یہ آزادی آپ کے نام ہے۔ اس آزادی کو عزت کے ساتھ آپ نے آگے بڑھانا ہے۔ اس زمین کے لیے فائدہ بخش بننا ہے۔ اس زمین کے ساتھ دغا نہیں کرنا۔ ہم زمین آپ کو دیں گے، اسے ملک آپ سب بنائیں گے۔

اور ہم ایک بات ہر اس شخص کو کہنا چاہیں گے جو آزادی کے لیے لڑ رہا ہے۔ آزادی کی اس جنگ میں یہ سوچ کر نہ لڑیں کہ آپ کو چوٹیں نہ آئیں گی، یا آپ کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ دل میں عدل کی انگیزش رکھنے والے سب کچھ گنوا دیتے ہیں۔ وہ آزادی کے لیے یا تو اپنی جان کی قربانی دیتے ہیں، یا پھر اپنے پیاروں کی۔ جب آزادی آپ کے قریب تر ہو گی، تب ہی آپ خود کو سب سے خالی محسوس کریں گے۔"

اس نے بات مکمل کی۔ آنکھوں میں محرومی تھی، لفظ بالکل خالی، کھوکلے۔ اور دل، وہ تو سالوں سے بنجر تھا۔

ڈیوڈ نے سب کچھ صفحے پر اتار لیا۔

"میں اجازت چاہوں گا، لیڈی یاسمین۔ جب کتاب چھپے گی، ایک جلد آپ کو ارسال کروں گا۔" وہ سر کو خم کے کھڑا ہوا۔

یاسمین بھی اسی کے ساتھ کھڑی ہوئی اور اسے دروازے تک لے کر گئی۔

وہ چلا گیا تو یاسمین نے کچھ دیر اس پھولوں سے بھری کیاری کو دیکھا۔

انہیں دیکھتے ہی اس نے گہری سانس خارج کی۔ گہری پر فسوں سانس۔

ٹھنڈ بڑھ رہی تھی، اس لیے وہ اندر چلی گئی۔

ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے اس کیاری میں لگے پھول لہرانے لگے۔

جس کیاری میں کبھی صرف جمال کے دیے گئے یاسمین کے پھول ہوا کرتے تھے۔

آج وہاں البرٹ کے دیے گئے گلاب بھی اپنی جگہ بنا چکے تھے۔

☆☆ تمت بالخیر ☆☆